اسلامی قانون

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

فہرست مضامین

۱۔ تمہید ۵
۲۔ قانون اور نظامِ زندگی کا باہمی تعلّق ۱۰
۳۔ نظامِ زندگی کی فکری اور اخلاقی بنیادیں ۱۱
۴۔ اسلامی نظامِ زندگی کا مآخذ ۱۲
۵۔ اسلام کا نظریۂ زندگی ۱۲
۶۔ حق کا بنیادی تصور ۱۳
۷۔ ”اسلام“ اور ”مسلم“ کے معنی ۱۴
۸۔ مسلم سوسائٹی کی حقیقت ۱۵
۹۔ شریعت کا مقصد اور اس کا اصول ۱۶
۱۰۔ شریعت کی ہمہ گیری ۱۹
۱۱۔ نظامِ شریعت کا ناقابلِ تقسیم ہونا ۲۰
۱۲۔ شریعت کا قانونی حصّہ ۲۳
۱۳۔ اسلامی قانون کے اہم شعبے ۲۴
۱۴۔ اسلامی قانون کا استقلال اور اس کی ترقی پذیری ۲۷

۱۵۔ اعتراضات اور جوابات ۳۱
۱۶۔ تہمت بوسیدگی ۳۱
۱۷۔ الزام وحشت ۳۲
۱۸۔ فقہی اختلافات کا بہانہ ۳۴
۱۹۔ غیر مسلم اقلیتوں کا مسئلہ ۳۷
۲۰۔ پاکستان میں اسلامی قانون کا نفاذ کس طرح ہو سکتا ہے ۳۸
۲۱۔ فوری انقلاب، نہ ممکن ہے، نہ مطلوب ۳۹
۲۲۔ بتدریج کا اصول ۴۰
۲۳۔ عہدِ نبوی کی مثال ۴۰
۲۴۔ انگریزی دَور کی مثال ۴۲
۲۵۔ تدریج ناگزیر ہے ۴۲
۲۶۔ ایک غلط بہانہ ۴۳
۲۷۔ صحیح ترتیب کار ۴۵
۲۸۔ اجراء قانون اسلامی کے لئے تعمیری کام ۴۸
۲۹۔ ایک قانونی اکیڈمی کا قیام ۴۸
۳۰۔ تدوین احکام ۵۳
۳۱۔ قانونی تعلیم کی اصلاح ۵۴
۳۲۔ عدالتی نظام کی اصلاح ۵۸
۳۳۔ پیشۂ وکالت کا انسداد ۵۸
۳۴۔ کورٹ فیس کا انسداد ۶۲
۳۵۔ خاتمۂ کلام ۶۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی قانون

یہ تقریر ۶ جنوری ۱۹۴۸ء کو لاکالج، لاہور میں کی گئی۔

آج کل کسی ملک میں، غیر مسلموں کے نہیں مسلمانوں کے اپنے ملک میں اگر اسلامی قانون کے جاری کرنے کا سوال اٹھایا جائے تو اعتراضات کی ایک بوچھاڑ ہوتی ہے جس سے آدمی کو سابقہ پیش آتا ہے۔ کیا صدیوں کا پرانا قانون جدید زمانے کی ایک سوسائٹی اور اسٹیٹ کی ضروریات کے لئے کافی ہوسکتا ہے؟ کیا ایک خاص زمانے کے قانون کو ہمیشہ کے لئے قابلِ عمل سمجھنا حماقت نہیں ہے؟ کیا اس مہذّب دَور میں ہاتھ کاٹنے اور کوڑے برسانے کی وحشیانہ سزائیں دی جائیں گی؟ کیا ہماری منڈیوں میں اب پھر غلام بکا کریں گے؟ اور آخر اس ملک میں مسلمانوں کے کس فرقے کی فقہ جاری ہوگی؟ پھر جو غیر مسلم یہاں رہتے ہیں وہ کیسے راضی ہوجائیں گے کہ مسلمانوں کا مذہبی قانون ان پر مسلط کر دیا جائے؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے سوالات ہیں جو تابڑ توڑ برسنے شروع ہوتے ہیں اور یہ برسات غیر مسلموں کی زبان سے نہیں بلکہ مسلمانوں کے اپنے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان سے ہوتی ہے۔

اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان لوگوں کو اسلام سے کوئی دشمنی ہے۔ دراصل اس کی وجہ ناواقفیت ہے۔ آدمی کا خاصہ ہے کہ وہ جس چیز کو نہیں جانتا اس کا نام سُن کر طرح طرح کے وسوسے اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور دُور کی شناسائی انسیت کی بجائے اکثر وحشت ہی بڑھاتی ہے۔ ہماری بدقسمتی کی طویل داستان کا ایک نہایت افسوسناک باب یہ بھی ہے کہ آج محض اغیار ہی نہیں، ہماری اپنی ملّت کے لوگ بھی اکثر اپنے دین اور اپنے اسلاف کے

چھوڑے ہوئے عظیم الشان ترکہ سے نابلد اور متوحش ہیں۔ اس حالت کو ہم اچانک نہیں پہنچ گئے ہیں۔ بلکہ صدیوں کے مسلسل انحطاط نے ہمیں یہاں تک پہنچا دیا ہے۔ پہلے مدت ہائے دراز تک ہمارے یہاں تہذیب و تمدن کا ارتقاء اور علوم و فنون کا نشوونما معطل رہا۔ پھر اس جمود کے نتیجے میں ہم پر سیاسی زوال آیا اور دنیا کی مسلمان قومیں یا تو براہ راست غیر مسلم حکومتوں کی غلام ہو گئیں یا ان میں سے بعض کو کچھ آزادی حاصل بھی رہی تو وہ غلامی سے کم نہ تھی ۔۔۔ کیونکہ شکست خوردگی کا اثر ان کے قلب و روح کی گہرائیوں تک اتر چکا تھا۔ آخر جب ہم نے اٹھنا چاہا تو ہر جگہ مسلمانوں کو خواہ وہ غلام تھے یا آزاد، اٹھنے کی ایک ہی صورت نظر آئی، اور وہ یہ تھی کہ جدید تہذیب و تمدن اور جدید علوم کا سہارا لے کر اٹھیں۔ ہمارے دینی علوم کے حامل جو طبقے تھے وہ خود اسی انحطاط میں مبتلا تھے جس میں ساری امت مبتلا تھی۔ دینی بنیادوں پر کوئی زندگی بخش اور انقلاب انگیز حرکت برپا کرنا ان کے بس میں نہ تھا، ان کی رہنمائی سے مایوس ہو کر امت کے بے چین طبقے دنیا کے اس نظام زندگی کی طرف متوجہ ہو گئے جو صریحاً کامیاب نظر آ رہا تھا۔ اسی سے انہوں نے اصول لئے، اسی کے علوم سیکھے، اسی کے تمدنی اداروں کا نقشہ حاصل کیا، اور اسی کے نقش قدم پر چل پڑے۔ رفتہ رفتہ اہل دین کا گروہ بالکل گوشۂ خمول میں پھینک دیا گیا، اور تمام مسلمان قوموں میں کارفرمائی کی باگیں اور کارکن طاقتیں انہیں لوگوں کے ہاتھ میں آ گئیں جو دین سے ناواقف اور تہذیب جدید کے فکری و عملی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دو کو چھوڑ کر تمام آزاد مسلم ممالک کی حکومتیں مغرب کی بے دین ریاستوں (SECULAR STATES) کے نمونے پر بن گئیں جن میں کہیں تو پوری اسلامی شریعت منسوخ ہو چکی ہے اور کہیں غیر دینی حکومت کے نظام میں مسلمانوں کے لئے محض ان کا پرسنل لا اسلامی رہنے دیا گیا ہے، یعنی مسلمانوں کی اپنی حکومت میں ان کو صرف وہ مذہبی حقوق عطا ہوئے ہیں جو اسلامی حکومتوں میں کبھی ذمیوں کو دئے جاتے تھے۔ اسی طرح جو ممالک غلام تھے

ان میں بھی تمام تہذیبی اداروں اور سیاسی تحریکوں کے کارفرما اسی قسم کے لوگ بنے اور آزادی کی طرف ان کا جو قدم بھی بڑھا اسی منزل کی طرف بڑھا جس پر دوسری آزاد مسلمان قومیں پہنچی ہوئی تھیں۔ اب اگر ان لوگوں سے اسلامی قانون اور اسلامی دستور کے نفاذ کا مطالبہ کیا جائے تو وہ بیچارے مجبور ہیں کہ اسے ٹالیں یا دبائیں کیونکہ وہ اس چیز کی ابجد تک سے ناواقف ہیں جس کے قیام و نفاذ کا ان سے مطالبہ کیا جاتا ہے جو تعلیم اور ذہنی و عملی تربیت انہوں نے پائی ہے وہ انہیں اسلامی قانون کی روح و مزاج سے اتنی دور لے جاچکی ہے کہ اس کو سمجھنا بھی ان کے لئے آسان نہیں رہا ہے، اور حاملانِ دین کی رہنمائی میں دینی تعلیم کا جو نظام چل رہا ہے وہ اس وقت تک بیسویں صدی کے لئے بارہویں صدی کے مردان کار تیار کرنے میں مشغول ہے۔ اس لئے کوئی ایسا گروہ بھی موجود نہیں ہے جو شاگردان مغرب کو ہٹاکر اسلامی آئین و قانون کے مطابق ایک جدید ریاست کا نظام بنا اور چلا سکے۔

---

[1] اسلامی شریعت کی تنسیخ کا سلسلہ سب سے پہلے ہندوستان میں شروع ہوا۔ یہاں انگریزی تسلط کے بعد بھی ایک مدت تک شریعت ہی کو قانون کی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ ۱۷۹۱ء تک اس ملک میں چور کا ہاتھ کاٹا جاتا رہا۔ مگر اس کے بعد انگریزی حکومت نے بتدریج اسلامی قوانین کو دوسرے قوانین سے بدلنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے پوری شریعت منسوخ ہو گئی، اور اس کا صرف وہ حصہ مسلمانوں کے پرسنل لا کی حیثیت سے باقی رہنے دیا گیا جو نکاح و طلاق وغیرہ مسائل سے متعلق تھا۔ پھر اسی نقش قدم پر خود وہ ممالک بھی چل پڑے جہاں مسلمانوں کی اپنی حکومتیں قائم تھیں۔ ہندوستان کی تمام مسلمان ریاستوں نے رفتہ رفتہ اپنے پبلک لا کو برطانوی ہند کے نمونے پر ڈھال لیا اور شریعت کو صرف پرسنل لا میں محدود کر دیا۔ مصری حکومت نے ۱۸۸۴ء میں اپنے پورے قانونی نظام کو فرنچ کوڈ کے مطابق بدل لیا اور محض نکاح و طلاق اور وراثت وغیرہ کے مسائل قاضیوں کے دائرہ اختیار میں چھوڑ دیئے، اس کے بعد بیسویں صدی میں البانیا اور ترکی نے ایک قدم اور بڑھایا۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

یہ واقعی ایک سخت پیچیدگی ہے، جس نے تمام مسلم ممالک میں اسلامی قانون و دستور کے نفاذ کو مشکل بنا رکھا ہے۔ مگر ہمارا معاملہ دوسرے مسلمان ملکوں سے بالکل مختلف ہے۔ ہم اس برعظیم ہند میں پچھلے دس سال سے اس بات پر لڑتے رہے ہیں کہ ہم اپنی مستقل تہذیب، الگ نظریۂ زندگی اور مخصوص آئینِ حیات رکھتے ہیں۔ ہمارے لئے مسلم و غیر مسلم کی ایک ایسی متحدہ قومیت ناقابلِ قبول ہے جس کا نظامِ زندگی لامحالہ ہمارے آئینِ حیات سے مختلف ہو گا۔ ہمیں ایک الگ خطۂ زمین درکار ہے جس میں ہم اپنے آئین پر زندگی کا نظام بنا اور چلا سکیں۔ ایک طویل اور اَن تھک کشمکش کے بعد بالآخر اب ہمیں وہ خطۂ زمین مل گیا ہے جس کا ہم مطالبہ کر رہے تھے اور اس کی قیمت میں ہم کو لاکھوں مسلمانوں کی جان، مال، آبرو، دینی پڑی ہے یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد اگر ہم نے یہاں اپنا وہ آئینِ حیات ہی نافذ نہ کیا جس کے لئے اتنے پاپڑ بیل کر اور اتنی بھاری قیمت ادا کر کے خطۂ زمین حاصل کیا گیا ہے تو ہم سے بڑھ کر زیاں کار اور کوئی نہ ہو گا۔ اسلامی دستور کے بجائے جمہوری لادینی دستور، اور اسلامی قانون کی جگہ تعزیرات ہند اور ضابطہ دیوانی ہی جاری کرنا تھا تو آخر ہندوستان کیا برا تھا کہ اتنے لڑائی جھگڑوں سے یہ پاکستان لیا جاتا، اور اگر ہمارا مقصد اشتراکی پروگرام نافذ کرنا تھا تو یہ "کارِ خیر" بھی

بقیہ: حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ انہوں نے صاف صاف اعلان کیا کہ ان کی حکومتیں بے دین حکومتیں ہیں، اور صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا کہ اپنے ملکی قوانین اٹلی، سوئٹزرلینڈ، فرانس اور جرمنی کے نمونوں پر ڈھال لئے بلکہ مسلمانوں کے پرسنل لا میں بھی وہ کھلی کھلی تحریفات کر ڈالیں جن کی جرأت کوئی "غیر مسلم حکومت" بھی نہ کر سکی تھی۔ چنانچہ البانیا میں تعددِ ازدواج کو قانوناً ممنوع ٹھیرا گیا اور ترکی میں نکاح، طلاق اور وراثت کے متعلق قرآن کے صریح احکام تک تبدیل کر ڈالے گئے۔ اب صرف افغانستان، اور سعودی عرب، دو ہی ملک دنیا میں ایسے رہ گئے ہیں جہاں شریعت کو ملکی قانون کی حیثیت حاصل ہے۔ اگرچہ شریعت کی روح وہاں سے بھی غائب ہے۔

ہندوستان کی سوشلسٹ یا کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ مل کر انجام دیا جا سکتا تھا۔ اس کے لئے بھی کوئی ضرورت نہ تھی کہ خواہ مخواہ اتنی جانفشانی اور اتنی بڑی قیمت پر پاکستان حاصل کرنے کی حماقت کی جاتی۔ دراصل ہم ایک قوم کی حیثیت سے اپنے آپ کو خدا اور خلق اور تاریخ کے سامنے آئین اسلامی کے نفاذ کے لئے پابند کر چکے ہیں، ہمارے لئے اب اپنے قول سے پھرنا ممکن نہیں رہا ہے۔ لہٰذا چاہے دوسری مسلمان قومیں کچھ بھی کرتی رہیں، ہمیں بہرحال ان ساری پیچیدگیوں کو حل کرنا ہی پڑے گا، جو اس کام کی راہ میں حائل ہیں۔

جہاں تک اسلامی قانون کے نفاذ کی عملی مشکلات کا تعلق ہے، ان سب کو دُور کرنے کی تدبیریں کی جا سکتی ہیں ان میں سے کوئی بھی اصلی مشکل نہیں ہے۔ اصلی مشکل صرف یہ ہے کہ وہ دماغ جن کی فکر و محنت اس کام کے لئے درکار ہے، بجائے خود مطمئن نہیں ہیں، اور ان کے عدم اطمینان کی وجہ ان کی عدم واقفیت ہے۔ اس لئے سب سے پہلے جو کام کرنے کا ہے وہ یہی ہے کہ انہیں واضح طریقہ پر یہ بتایا جائے کہ اسلامی قانون کس چیز کا نام ہے اس کی حقیقت کیا ہے، اس کا مقصد، اس کے اصول، اس کی روح اور اس کا مزاج کیا ہے، اس میں کیا چیز قطعی اور مستقل ہے، اور اس کے ایسا ہونے کا فائدہ کیا ہے، اور اس میں کون سی چیز ابد تک ترقی پذیر ہے اور وہ کس طرح ہر دَور میں ہماری بڑھتی ہوئی تمدنی ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے، اس کے احکام کن مصالح پر مبنی ہیں اور ان غلط فہمیوں کی کیا اصلیت ہے جو ان احکام کے متعلق ناواقف لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر یہ تفہیم صحیح طریقہ پر ہو جائے تو ہمیں یقین ہے کہ ہمارے بہترین کارفرما اور کارکن دماغ مطمئن ہو جائیں گے اور ان کا اطمینان ان ساری تدبیروں کا دروازہ کھول دے گا جو اسلامی قانون کے نفاذ کو عملاً ممکن بنا سکتی ہیں۔ میری آج کی تقریر اسی تعارف کے لئے ہے۔

قانون اور نظامِ زندگی کا باہمی تعلق

قانون کے لفظ سے ہم جس چیز کو تعبیر کرتے ہیں وہ دراصل اس سوال کا جواب ہے کہ انسانی طرزِ عمل، انفرادی اور اجتماعی طور پر کیا ہونا چاہیئے۔ اس سوال کا دائرہ اس دائرہ سے بہت زیادہ وسیع ہے جس میں قانون اس کا جواب دیتا ہے۔ ہم کو بہت وسیع پیمانے پر اس "ہونا چاہیئے" کے سوال سے سابقہ پیش آتا ہے اور اس کے بے شمار جوابات ہیں جو مختلف عنوانات کے تحت مرتب ہوتے ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ ہماری اخلاقی تعلیم و تربیت میں شامل ہوتا ہے اور اسی کے مطابق ہم اپنے افراد کی سیرت و کردار کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا ایک دوسرا مجموعہ ہمارے معاشرتی نظام میں داخل ہوتا ہے اور اسی کے لحاظ سے ہم اپنی معاشرت میں مختلف قسم کے انسانی تعلقات کو منضبط کرتے ہیں۔

ان کا ایک تیسرا مجموعہ ہمارے معاشی نظام میں جگہ پاتا ہے اور اسی کی روشنی میں ہم دولت اور اس کی پیدائش اور اس کی تقسیم اور اس کے تبادلے اور اس پر لوگوں کے حقوق کا ضابطہ بناتے ہیں۔ غرض اسی طریقے پر ان پر جوابات کے بہت سے مجموعے بن جاتے ہیں۔ جو ہماری زندگی کے مختلف شعبوں کی شکل اور ان کے ضوابطِ عمل معین کرتے ہیں، اور قانون ان بہت سے مجموعوں میں سے صرف ان جوابات پر مشتمل ہوتا ہے جن کو نافذ کرنے کے لئے سیاسی اقتدار استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص کسی قانون کو سمجھنا چاہے تو یہ کافی نہیں ہے کہ وہ اپنی تحقیقات کو صرف اسی دائرے پر منحصر کر دے جس میں قانون نے اس "ہونا چاہیئے" کے سوال کا جواب دیا ہے۔ بلکہ اسے سوسائٹی کی اس پوری اسکیم کو سمجھنے کی کوشش کرنی ہوگی جس میں زندگی کے ہر شعبے کے متعلق اس سوال کا جواب دیا گیا ہے۔

اس لئے کہ قانون اسی اسکیم کا ایک جزو ہے اور اس جزو کے مزاج کو سمجھنا یا اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ کل کو سمجھا جائے۔

نظامِ زندگی کی فکری اور اخلاقی بنیادیں

پھر زندگی کے پورے دائرے میں "ہم "کیا ہونا چاہئے" کے سوال کا جو جواب دیتے ہیں وہ دراصل ایک دوسرے سوال یعنی "کیوں ہونا چاہئے" کے جواب سے ماخوذ ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ "کیا ہونا چاہئے" کے متعلق ہمارے تمام جوابات دراصل ان نظریات پر مبنی ہوتے ہیں جو ہم نے انسانی زندگی اور اس کے خیر و شر اور اس کے حق و باطل اور صحیح و غلط کے بارے میں قائم یا اختیار کئے ہیں، اور ان نظریات کی نوعیت متعین کرنے میں اس ماخذ یا مآخذ کا بہت بڑا دخل، بلکہ اصلی فیصلہ کن اثر ہوتا ہے۔ جہاں سے ہم نے ان نظریات کو اخذ کیا ہے۔ دنیا میں مختلف انسانی گروہوں کے قوانین کا اختلاف اسی وجہ سے ہے کہ انسانی زندگی کے متعلق ان کے نظریات ایک ماخذ سے لئے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ان کے مآخذ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس اختلاف کے باعث ان کے نظریئے مختلف ہوئے۔ ان کے اختلاف نے زندگی کی اسکیمیں مختلف کر دیں اور پھر ان اسکیموں کے جو حصے قانون سے متعلق ہیں وہ بھی لازماً مختلف ہو کر رہے۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم زندگی کی کسی خاص اسکیم کے بنیادی نظریات اور ان کے مآخذ اور ان سے وجود میں آنے والے پورے نظامِ حیات کو سمجھے بغیر صرف اس کے قانونی حصے کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکیں اور وہ بھی اس قانونی حصہ کا تفصیلی مطالعہ کر کے نہیں بلکہ اس کے بعض پہلوؤں کے بارے میں چند اڑتی ہوئی خبریں سن کر!

میں یہاں تقابلی مطالعے (COMPARATIVE STUDY) کا ارادہ نہیں رکھتا اگرچہ بات پوری طرح تو اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب مغربی نظامِ زندگی کو جس کا قانون آپ پڑھتے اور اپنے ملک میں جاری کرتے ہیں، اسلامی نظامِ زندگی کے بالمقابل رکھ کر دیکھا جائے کہ ان کے درمیان کیا اختلاف ہے اور اس اختلاف نے کیوں ان کے قوانین کو

مختلف کر دیا ہے لیکن اس بحث سے گفتگو طویل ہو جائے گی اس لئے میں صرف اسلامی نظامِ زندگی کی تشریح پر اکتفا کر دوں گا۔

اسلامی نظامِ زندگی کا ماخذ

اسلام جس زندگی کا نام ہے اس کا ماخذ ایک کتاب ہے جس کے مختلف ایڈیشن قدیم ترین زمانے سے توراۃ، انجیل، زبور وغیرہ بہت سے ناموں کے ساتھ دنیا میں شائع ہوتے رہے اور آخری ایڈیشن قرآن کے نام سے انسانیت کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس کتاب کا اصل نام اسلام کی اصطلاح میں الکتاب (THE BOOK) ہے اور یہ دوسرے نام دراصل اس کے ایڈیشنوں کے نام ہیں۔ اس کا دوسرا ماخذ وہ لوگ ہیں جو مختلف زبانوں میں اس الکتاب کو لے کر آئے اور جنہوں نے اپنے قول و عمل سے اس کے منشاء کی ترجمانی کی۔ یہ لوگ اگرچہ الگ الگ اشخاص ہونے کی حیثیت سے نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور محمدؐ (علیہم الصلوٰۃ والسلام اجمعین) وغیرہ ناموں سے موسوم ہیں لیکن اس بناء پر کہ یہ ایک گروہ کے اشخاص ہیں جو ایک ہی مشن لے کر اٹھے۔ ان سب کو ایک جامع نام الرسول سے موسوم کرنا بالکل صحیح ہے۔

اسلام کا نظریۂ زندگی

اس الکتاب اور الرسول نے زندگی کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ عظیم الشان کائنات کا جو تمہیں صریحاً ایک زبردست نظام میں جکڑی ہوئی اور ایک مقرّر قانون پر چلتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ دراصل ایک خدا کی حکومت ہے، خدا ہی اس کا خالق ہے، وہی اس کا مالک ہے اور وہی اس کا فرمانروا ہے یہ زمین جس پر تم رہتے ہو۔ اس کی بے پایاں سلطنت کے لاتعداد صوبوں میں سے ایک چھوٹا سا صوبہ ہے اور یہ

صوبہ بھی مرکزی اقتدار کی اس گرفت میں پوری طرح جکڑا ہوا ہے۔ جس میں اس جہانِ ہست و بود کا ہر حصّہ جکڑا ہوا ہے۔ تم اس صوبے میں خدا کی پیدائشی رعیت (BORN SUBJECT) ہو۔ تم اپنے خالق آپ نہیں ہو بلکہ اس کی مخلوق ہو۔ اپنے پروردگار آپ نہیں ہو بلکہ اس کے پروردہ ہو۔ اپنے بل پر نہیں جی رہے ہو بلکہ اس کے جِلائے جی رہے ہو۔ اس لئے تمہارے ذہن میں اپنی خودمختاری کا اگر کوئی زعم ہے تو وہ ایک غلط فہمی اور نفس کے ایک دھوکے سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اپنی زندگی کے ایک بہت بڑے حصّہ میں تم تو صریح طور پر رعیت ہو اور اپنی محکومی کو خود جانتے ہو۔ اپنی ماؤں کے پیٹوں میں استقرارِ حمل سے لیکر اپنی موت کی آخری ساعت تک تم خدا کے قانونِ طبیعی (LOW OF NATURE) سے اس طرح بندھے ہوئے ہو کہ ایک سانس تک اس کے خلاف نہیں لے سکتے اور تمہارے اوپر فطرت کی قوتیں اور قوانین اس طرح حاوی ہیں کہ تم جو کچھ کر سکتے ہو ان کے تحت رہ کر ہی کر سکتے ہو۔ ایک لمحہ کے لئے بھی تمہارا ان سے آزاد ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ اب رہ گیا تمہاری زندگی کا اختیاری حصّہ جس میں تم اپنے اندر ارادے کی آزادی محسوس کرتے ہو اور اپنی پسند کے مطابق انفرادی و اجتماعی عمل کی راہیں انتخاب کرنے کی طاقت پاتے ہو تو بلاشبہ تمہیں اس حد تک آزادی حاصل ہے۔ مگر یہ آزادی تمہیں فرمانروائے کائنات کی رعیت ہونے سے خارج نہیں کر دیتی بلکہ صرف یہ اختیار دیتی ہے کہ چاہو تو اطاعت کا رویہ اختیار کرو جو پیدائشی رعیت ہونے کی حیثیت سے تمہیں اختیار کرنا چاہئے اور چاہو تو خودمختاری اور بغاوت کا رویہ اختیار کرو جو اپنی فطرت اور حقیقت کے اعتبار سے تمہیں نہ اختیار کرنا چاہئے۔

حق کا بنیادی تصوّر

یہاں سے حق کا سوال پیدا ہوتا ہے اور یہ اوّلین بنیادی حق کا سوال ہے جو

تمام چھوٹے سے چھوٹے جزوی معاملات تک حق اور باطل کے فیصلے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ زندگی کی حقیقت کا جو نظریہ "الکتاب" اور "الرسول" نے پیش کیا ہے اس کو بطور ایک امر واقعہ (FACT) کے تسلیم کر لینے کے بعد یہ بات صریح طور پر حق قرار پا جاتی ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے اختیاری حصہ میں بھی اسی خدا کی حاکمیت (SOVEREIGNTY) تسلیم کرے جو اس کی زندگی کے پورے غیر اختیاری حصہ کا اور اس تمام کائنات کا جس میں یہ زندگی بسر ہو رہی ہے، آپ سے آپ حاکم (SOVEREIGN) ہے۔ یہ چیز کئی وجوہ سے حق ہے۔ یہ اس لئے بھی حق ہے کہ انسان جن قوتوں اور جن جسمانی آلات سے اپنے اختیارات کو استعمال کرتا ہے وہ خدا کا عطیہ ہیں۔ اس لئے بھی حق ہے کہ خود یہ اختیارات انسان کے اپنے حاصل کردہ نہیں ہیں بلکہ تفویض کردہ (DELEGATED) ہیں۔ اس لئے بھی حق ہے کہ جن چیزوں پر یہ اختیارات استعمال کئے جاتے ہیں وہ سب خدا کی مِلک ہیں۔ اس لئے بھی حق ہے کہ جس ملک میں استعمال کئے جاتے ہیں وہ خدا کا ملک ہے اور اس لئے بھی حق ہے کہ عالم کائنات اور حیاتِ انسانی کی ہمواری (HARMONEY) کا تقاضا یہی ہے کہ ہماری زندگی کے اختیاری اور غیر اختیاری دونوں حصوں کا حاکم اور سرچشمہ احکام ایک ہی ہو۔ ان دو حصوں کے دو الگ اور ایک دوسرے سے مختلف قبیلے بن جانے سے ایسا تضاد پیدا ہو جاتا ہے جو موجب فساد ہو کر رہتا ہے ایک شخص کی زندگی میں تو اس چیز کا فساد محدود پیمانے پر ہی ظاہر ہوتا ہے مگر بڑی بڑی قوموں کی زندگی میں اس کے بُرے نتائج اتنے بڑے پیمانے پر نکلتے ہیں کہ خشکی اور تری اور ہوا فساد سے بھر جاتی ہے۔

"اسلام" اور "مسلم" کے معنی

"الکتاب" اور "الرسول" انسان کے سامنے اس کو حق پیش کرتے ہیں اور

اسی کو دعوت دیتے ہیں کہ کسی دباؤ کے بغیر وہ اپنی خوشی سے اس کو قبول کرلے۔ چونکہ یہ انسانی زندگی کے اس حصے کا معاملہ ہے جس میں خدا نے انسان کو خود اختیار دیا ہے اس لئے یہ بات کہ انسان اس حصے میں خدا کو اپنا حاکم مانے کسی دباؤ سے نہیں منوائی جاتی بلکہ برضا و رغبت تسلیم کرائی جاتی ہے جس کا اطمینان بھی اس بیان واقعہ (STATEMENT OF FACTS) پر ہو جائے جو "الکتاب" اور "الرسول" نے کائنات کی حقیقت کے متعلق دیا ہے اور جس کا ضمیر بھی اس امر کی گواہی دے کہ اس واقعی حقیقت کی موجودگی میں حق وہی ہے جو منطقی نتیجہ کے طور پر اس سے نکلتا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے اپنی آزادی و خود مختاری، خدا کی حاکمیت کے آگے تسلیم (SURRENDER) کر دے۔ اسی تسلیم کا نام اسلام ہے اور جو تسلیم کا یہ فعل کریں وہ "مسلم" کہلاتے ہیں۔ یعنی ایسے لوگ جنہوں نے خدا کی حاکمیت مان لی اپنی خود مختاری سے اس کے حق میں دست بردار ہو گئے، اور اس بات کو انہوں نے خود اپنے اوپر لازم کر لیا کہ اپنی زندگی کا نظام خدا کے احکام کے مطابق چلائیں گے۔

مسلم سوسائٹی کی حقیقت

اب ایسے تمام لوگ جنہوں نے تسلیم کا یہ فعل کیا ہو ایک وحدت میں منسلک کئے جاتے ہیں، اور ان کے اجتماع سے "مسلم" سوسائٹی کی تشکیل و تنظیم ہوتی ہے۔ یہ سوسائٹی ان سوسائٹیوں سے بالکل مختلف ہے۔ جو اتفاقی حوادث کے نتیجہ میں بنتی ہیں اس کی تشکیل ایک ارادی فعل سے ہوتی ہے اور اس کی تنظیم ایک ایسے معاہدے (CONTRACTS) کے ذریعہ سے عمل میں آتی ہے جو خدا اور بندوں کے درمیان شعوری طور پر واقع ہوتا ہے۔ اس معاہدے میں بندے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ خدا ان کا حاکم ہے، اسی کی ہدایت ان کے لئے دستور زندگی ہے، اسی کے احکام ان کے لئے قانون ہیں، وہ اسی کو خیر مانیں گے جسے خدا خیر بتائے گا اور اسی کو شر تسلیم کریں گے جسے

خدا شر کہے گا، صحیح اور غلط اور جائز و ناجائز کا معیار وہ خدا ہی سے لیں گے اور اپنی آزادی کو ان حدود کے اندر محدود رکھیں گے جو خدا ان کے لئے کھینچ دے گا۔ مختصر یہ کہ اس معاہدے کی بنیاد پر جو سوسائٹی بنتی ہے وہ واضح طور پر یہ اقرار کرتی ہے کہ وہ اپنے معاملات زندگی میں "کیا ہونا چاہئے" کا جواب خود تجویز نہیں کرے گی بلکہ اس جواب کو قبول کرے گی جو خدا کی طرف سے ملے گا۔

اس واضح اقرار کی بنیاد پر جب ایک سوسائٹی بن جاتی ہے تو الکتاب اور الرسول اسے ایک ضابطۂ زندگی دیتے ہیں جو "شریعت" کہلاتا ہے اور سوسائٹی پر خود اپنے ہی اقرار کی وجہ سے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ اپنے معاملات زندگی کو اس اسکیم کے مطابق چلائے جو اس شریعت میں تجویز کی گئی ہے، تاوقتیکہ کسی شخص کی عقل بالکل ہی خبط نہ ہو گئی ہو وہ کسی طرح اس بات کو ممکن فرض نہیں کر سکتا کہ کوئی مسلم سوسائٹی اپنے بنیادی معاہدے کو توڑے بغیر شریعت کے سوا کوئی دوسرا ضابطۂ زندگی اختیار کر سکتی ہے۔ دوسرا ضابطہ اختیار کرنے کے ساتھ ہی معاہدہ خود بخود ٹوٹ جاتا ہے اور اس کے ٹوٹتے ہی وہ سوسائٹی "مسلم" کے بجائے غیر مسلم بن جاتی ہے۔ اتفاقی طور پر کسی شخص کا اپنی زندگی کے کسی معاملہ میں شریعت کی خلاف ورزی کر بیٹھنا اور چیز ہے۔ اس سے معاہدہ ٹوٹتا نہیں ہے بلکہ صرف ایک جرم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ لیکن اگر ایک پوری سوسائٹی جان بوجھ کر یہ طے کر لے کہ شریعت اب اس کا ضابطۂ حیات نہیں ہے اور یہ کہ اپنا ضابطہ اب وہ خود تجویز کرے گی، یا کسی دوسرے ماخذ سے لے گی، تو یقیناً یہ ایک فسخ معاہدہ کا فعل ہے اور قطعاً کوئی وجہ نہیں کہ ایسی سوسائٹی پر لفظ "مسلم" کا اطلاق درست ہو۔

شریعت کا مقصد اور اس کا اصول

ان بنیادی امور کی توضیح کے بعد اب ہمیں اس اسکیم کو سمجھنے کی کوشش کرنی

چاہیئے جو انسانی زندگی کے لئے شریعت نے تجویز کی ہے۔ اس غرض کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ ہم پہلے اس کے مقصد اور اس کے بڑے بڑے اصولوں کا جائزہ لے لیں۔

اس کا مقصد انسانی زندگی کے نظام کو معروفات پر قائم کرنا اور منکرات سے پاک کرنا ہے۔ معروفات سے مراد وہ نیکیاں، خوبیاں اور بھلائیاں ہیں جن کو انسانی فطرت ہمیشہ سے بھلائی کی حیثیت سے جانتی ہے اور منکرات سے مراد وہ برائیاں ہیں جن کو ہمیشہ سے انسانیت کا ضمیر بُرا جانتا آیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں معروف فطرت انسانی سے مناسبت رکھنے والی چیز ہے اور منکر اس کے خلاف ہے۔

وہ ہمارے لئے ان ہی چیزوں کو بھلائی قرار دیتی ہے جو خدا کی بنائی ہوئی فطرت کے مطابق ہیں اور ان ہی چیزوں کو برا قرار دیتی ہے جو اس فطرت سے موافقت نہیں رکھتیں وہ ان بھلائیوں اور برائیوں کی محض ایک فہرست ہی بنا کر ہمارے حوالے کر دینے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ زندگی کی پوری اسکیم ایسے نقشے پر بناتی ہے کہ اس کی بنیادیں معروف بھلائیوں پر قائم ہوں اور معروفات اس میں پروان چڑھ سکیں اور منکرات کو اس کی تعمیر میں شامل ہونے سے روکا جائے اور نظامِ زندگی میں ان کے دوڑانے اور ان کا زہر پھیلنے کے مواقع باقی نہ رہنے دئے جائیں۔

اس غرض کے لئے وہ معروفات کے ساتھ ان اسباب اور ذرائع کو بھی اپنی اسکیم میں شامل کرتی ہے جن سے وہ قائم ہو سکتے ہیں اور پروان چڑھ سکتے ہیں اور ان موانع کو ہٹانے کا انتظام بھی تجویز کرتی ہے جو معروفات کے قیام اور نشو و نما میں کسی طور پر سدراہ ہو سکتے ہوں۔ اس طرح اصل معروفات کے ساتھ ان کے وسائل قیام و ترقی بھی معروف میں شمار ہو جاتے ہیں اور ان کے موانع منکرات کی فہرست میں شامل کر دئے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ منکرات کے ساتھ بھی ہے اصل منکرات کے ساتھ وہ چیزیں بھی منکر قرار پاتی ہیں جو کسی منکر کے وقوع یا ظہور یا نشو و نما کا ذریعہ بنیں۔ سوسائٹی کے

پورے نظام کو شریعت اس طرز پر ڈھالتی ہے کہ ایک ایک معروف اپنی پوری صورت میں قائم ہو۔ زندگی کے تمام متعلق شعبوں میں اس کا ظہور ہو، ہر طرف سے اس کو قائم ہونے اور پروان چڑھنے میں مدد ملے اور ہر وہ رکاوٹ دُور کی جائے جو کسی طرح سے اس کی راہ میں حائل ہو سکتی ہو۔ اسی طرح ایک ایک منکر کو چن چن کر زندگی سے نکالا جائے، اس کی پیدائش اور نشوونما کے اسباب روکے جائیں، جدھر جدھر سے وہ زندگی میں گھس سکتا ہے اس کا راستہ بند کیا جائے اور اگر وہ سر اٹھا ہی لے تو پھر سختی کے ساتھ اسے دبا دیا جائے۔

معروفات کو شریعت تین قسموں پر تقسیم کرتی ہے ایک واجب یا فرض دوسرے مندوب یعنی مطلوب تیسرے مباح یعنی جائز۔

فرض و واجب وہ معروفات ہیں جو مسلم سوسائٹی پر لازم کئے گئے ان کے متعلق شریعت صاف صاف اور قطعی احکام دیتی ہے۔

مطلوب وہ معروفات ہیں جن کو شریعت چاہتی ہے یا پسند کرتی ہے کہ وہ سوسائٹی میں قائم اور جاری ہوں ان میں سے بعض کو صاف صاف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور بعض کا اشارہ شارع کے ارشادات سے نکلتا ہے۔ بعض کے قیام نشوونما کا بندوبست کیا گیا اور بعض کی صرف سفارش کی گئی ہے۔ تاکہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی یا اس کے صالح لوگ ان کی طرف خود توجہ کریں۔

رہے مباح معروفات، تو شریعت کی زبان میں ہر وہ چیز مباح ہے جس کی ممانعت نہ کی گئی ہو۔ اس تعریف کی بنا پر مباحات صرف وہی نہیں ہیں جن کی اجازت کی تصریح ہو یا جن کے معاملہ میں ہمیں صاف طور پر اختیار دیا گیا ہو بلکہ ان کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے حتیٰ کہ چند بیان کردہ ممنوعات کو چھوڑ کر دنیا میں سب کچھ مباح ٹھیرتا ہے یہی مباحات کا دائرہ وہ دائرہ ہے جس میں شریعت نے ہم کو آزادئ عمل دی ہے اور اسی دائرہ میں ہم کو اپنی ضرورتوں کے مطابق قوانین ضوابط اور طریق کار خود تجویز کر لینے کے اختیارات حاصل ہیں۔

منکرات کو شریعت میں دو قسموں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حرام، یعنی قطعی ممنوع دوسرے مکروہ یعنی ناپسندیدہ، حرام وہ ہے جس سے باز رہنا اور اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس سے پاک رکھنا مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا ہے، اور شریعت میں اس کے متعلق صاف صاف احکام دیدیئے گئے ہیں۔ رہا مکروہ تو اس کے متعلق شارع کسی نہ کسی طور پر صراحۃً یا کنایتہً ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے جس سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس درجہ میں ناپسندیدہ ہے۔ بعض مکروہات حرام کے قریب ہیں اور بعض مباح کی سرحد سے ملے ہوئے ہیں اور بہت سے ان کے درمیانی مراتب پر ہیں۔ بعض کو روکنے اور بند کرنے کا شریعت کے نظام میں بندوبست کیا گیا ہے اور بعض کو ناپسندیدہ بتا کر چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ سوسائٹی خود یا اس کے صالح عناصر ان کا سدِ باب کریں۔

شریعت کی ہمہ گیری

معروف اور منکر کے متعلق یہ احکام ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مذہبی عبادات، شخصی کردار، اخلاق اور عادات، کھانا پینا پہننا، اوڑھنا، نشست و برخاست، بات چیت، خاندانی زندگی، معاشرتی تعلقات معاشی معاملات، ملکی انتظام، شہریت کے حقوق و واجبات، قیامِ عدل کا نظام، حکومت کے طریقے، صلح و جنگ اور دوسری قوموں کیساتھ تعلقات، غرض زندگی کا کوئی شعبہ اور پہلو ایسا نہیں رہ گیا ہے جس کے متعلق شریعت نے ہم پر نیکی اور بدی کے طریقے، بھلائی اور برائی کے راستے اور پاک و ناپاک کے امتیازات واضح نہ کر دیئے ہوں وہ ہمیں ایک صالح نظام زندگی کا پورا نقشہ دیتی ہے جس میں صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ کیا بھلائیاں ہیں جنہیں ہم کو قائم کرنا، بڑھانا اور نشو و نما دینا ہے کیا برائیاں ہیں جن کو دبانا اور مٹانا ہے، کن حدود کے اندر ہماری آزادیٔ عمل کو محدود رہنا چاہیئے اور عملاً ہمیں کون سے طریقے اختیار کرنے چاہیئیں جن سے

ہماری زندگی میں مطلوبہ بھلائیاں پروان چڑھیں اور برائیوں کا استیصال ہو۔

نظامِ شریعت کا ناقابلِ تقسیم ہونا

یہ پورا نقشۂ زندگی ایک ہی نقشۂ زندگی ہے اور اس کا ایک مجموعی مزاج ہے جو تقسیم ہو کر قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کی وحدت کچھ اسی طرح کی ہے جیسی خود انسان کے وجود کی وحدت ہے۔ آپ جس چیز کو انسان کہتے ہیں وہ آدمی کا سالم وجود ہے نہ کہ انسانی جسم کے الگ الگ کئے ہوئے ٹکڑوں کا مجموعہ۔ ایک کٹی ہوئی ٹانگ کو آپ ۱/۲ انسان یا ۱/۴ انسان نہیں کہہ سکتے۔ نہ یہ کٹی ہوئی ٹانگ ان خدمات میں سے کوئی خدمت انجام دے سکتی ہے جو زندہ اور سالم جسم کا ایک عضو ہونے کی صورت میں وہ انجام دیا کرتی ہے۔ نہ اس ٹانگ کو کسی اور جانور کے جسم میں لگا کر آپ یہ توقع کر سکتے ہیں کہ اس جانور میں ایک ٹانگ کے بقدر انسانیت پیدا ہو جائے گی، اور نہ انسانی جسم کے ہاتھ، پاؤں، آنکھ، ناک وغیرہ الگ الگ لے کر آپ ان کے حسن یا ان کے فائدے کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکتے ہیں جب تک کہ پورے زندہ جسم میں ان کے تناسب اور ان کے عمل کو نہ دیکھیں۔ ٹھیک یہی حال شریعت کے نقشۂ زندگی کا بھی ہے۔ اسلام اس پورے نقشہ کا نام ہے نہ کہ اس کے جدا جدا ٹکڑوں کا۔ اس کے اجزا کو پارہ پارہ کر کے نہ تو ان کے بارے میں جداگانہ رائے زنی کرنا درست ہو سکتا ہے، نہ مجموعہ سے الگ ہو کر اس کا کوئی جزء وہ کام کر سکتا ہے جو وہ صرف اپنے مجموعہ ہی میں رہ کر کیا کرتا ہے، نہ کسی دوسرے نظام زندگی میں اس کے کسی جزء یا اجزاء کو پیوست کر کے کوئی مفید نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ شارع نے یہ نقشہ اس لئے بنایا ہے کہ یہ پورا کا پورا ایک ساتھ قائم ہو، نہ اس لئے کہ آپ حسبِ منشاء اس کے کسی جزء کو جب چاہیں لے کر قائم کر دیں، بغیر اس کے کہ دوسرے اجزاء اس کے ساتھ ہوں۔ اس کا ہر جزء دوسرے اجزاء کے ساتھ اس طرح جڑا ہوا ہے کہ ان کے ساتھ مل کر ہی کام کر سکتا ہے اور آپ کی

اس خوبی کے متعلق صحیح رائے صرف اسی وقت قائم کر سکتے ہیں جب کہ پورے نظام اسلامی کے تناسب اور عمل میں اس کام کو کرتے ہوئے دیکھیں۔

آج شریعت کے بعض احکام کے متعلق جو غلط فہمیاں لوگوں میں پائی جاتی ہیں ان میں سے اکثر کی وجہ یہی ہے کہ پورے اسلام پر مجموعی نگاہ ڈالے بغیر اس کے کسی ایک جزر کو نکال لیا جاتا ہے اور پھر یا تو اسے موجودہ غیر اسلامی نظام زندگی کے اندر رکھ کر رائے قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یا پھر بجائے خود اسی جزر کو ایک مستقل چیز سمجھ کر اس کے حسن و قبح کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اسلامی قانون فوجداری کی بعض دفعات پر آج کے لوگ بہت ناک بھوں چڑھاتے ہیں لیکن انہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ جس نقشۂ زندگی میں یہ قانونی دفعات رکھی گئی ہیں اس کے اندر ان کے ساتھ ایک نظامِ معیشت، ایک نظامِ معاشرت، ایک نظامِ حکومت اور ایک نظامِ تعلیم و تربیت بھی ہے جو اگر ساتھ ساتھ پوری اجتماعی زندگی میں کام نہ کر رہا ہو تو ان تعزیری دفعات کو قانون کی کتاب سے نکال کر عدالت کے کمرے میں جاری کر دینا خود اس نقشۂ زندگی کے بھی خلاف ہے۔ بلاشبہ اسلامی قانون چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا دیتا ہے، مگر یہ حکم ہر سوسائٹی میں جاری ہونے کے لئے نہیں دیا گیا ہے، بلکہ اسے اسلام کی اس سوسائٹی میں جاری کرنا مقصود تھا جس کے مالداروں سے زکوٰۃ لی جا رہی ہو جس کا بیت المال ہر حاجت مند کی امداد کے لئے کھلا ہو، جس کی ہر بستی پر مسافروں کی تین دن ضیافت لازم کی گئی ہو، جس کے نظامِ شریعت میں سب لوگوں کے لئے بالکل یکساں حقوق اور برابر کے مواقع ہوں، جس کے معاشی نظام میں طبقوں کی اجارہ داری کے لئے کوئی جگہ نہ ہو اور جائز کسب معاش کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوں، جس کے نظامِ تعلیم و تربیت نے ملک کے عام افراد میں خدا کا خوف اور اس کی رضا کا شوق پیدا کر دیا ہو، جس کے اخلاقی ماحول میں فیاضی، مصیبت زدوں کی دست گیری، حاجت مندوں کی اعانت اور گرتوں کو سہارا دینے کا عام چرچا ہو

اور جس کے بچّے بچّے کو یہ سبق دیا گیا ہو کہ تو مومن نہیں ہے اگر تیرا ہمسایہ بھوکا ہو اور تو خود پیٹ بھر کر کھانا کھا بیٹھے۔ یہ حکم آپ کی موجودہ سوسائٹی کے لئے نہیں دیا گیا تھا جس میں کوئی شخص کسی کو قرض بھی سود کے بغیر نہیں دیتا۔ جس میں بیت المال کی جگہ بینک اور انشورنس کمپنی ہے جس میں حاجت مند کے لئے مدد کو بڑھنے والے ہاتھ کی جگہ دھتکار اور پھٹکار ہے جس کا اخلاقی نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک شخص کی کمائی میں دوسروں کا کوئی حصّہ نہیں بلکہ ہر شخص اپنی کفالت کا خود ذمہ دار ہے جس کا معاشرتی نظام بعض خاص طبقوں کو مخصوص امتیازی حقوق دیتا ہے جس کا معاشی نظام چند خوش نصیب اور چالاک لوگوں کو ہر طرف سے دولت سمیٹ لینے کا موقع دیتا ہے اور جس کا سیاسی نظام اپنے قوانین کے ذریعے سے ان کے مفاد کی حفاظت کرتا ہے۔ ایسی سوسائٹی میں چور کا ہاتھ کاٹنا تو کیا معنی شاید اکثر حالات میں تو اس کو سرے سے کوئی سزا دینا ہی درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس قسم کی سوسائٹی میں چوری کو جرم قرار دینا دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ خود غرض اور حرام خور لوگوں کے مال کی حفاظت پیشِ نظر ہے۔ برعکس اس کے اسلام وہ سوسائٹی پیدا کرتا ہے جس میں کسی شخص کے لئے چوری پر مجبور ہونے کا کوئی موقع نہ رہے، ہر ضرورت مند انسان کی جائز ضروریات پوری کرنے کے لئے لوگ خود ہی رضاکارانہ طور پر آمادہ ہوں اور حکومت کی طرف سے بھی اس کی دست گیری کا پورا انتظام ہو۔ پھر جو شخص اس کے باوجود چوری کرے اس کے لئے اسلامی قانون ہاتھ کاٹنے کی عبرت ناک سزا تجویز کرتا ہے، کیونکہ ایسا شخص ایک شریف، عادل اور فیاض سوسائٹی میں رہنے کے قابل نہیں ہے۔

اسی طرح اسلامی قانون تعزیرات زنا پر سو کوڑے مارتا ہے اور شادی شدہ زناکار کو سنگسار کر دیتا ہے۔ مگر یہ کس سوسائٹی میں؟ اس میں جس کے پورے نظامِ تمدن کو شہوت انگیز اسباب سے خالی کیا گیا ہو، جس میں — عورتوں اور مردوں کی مخلوط معاشرت نہ ہو۔ جس میں بنی سنوری عورتوں کا منظرِ عام پر آنا بند ہو۔ جس میں نکاح کو

نہایت آسان کر دیا گیا ہو جس میں نیکی اور تقویٰ اور پاکیزگیٔ اخلاق کا عام چرچا ہو اور جس کے ماحول میں خدا کی یاد ہر وقت تازہ ہوتی رہتی ہو۔ یہ حکم اس گندی سوسائٹی کے لئے نہیں ہے جس میں ہر طرف جنسی جذبات کو بھڑکانے کے اسباب پھیلے ہوئے ہیں۔ گلی گلی اور گھر گھر فحش گیت بج رہے ہیں۔ جگہ جگہ فلم اسٹاروں کی تصویریں لٹکی ہوئی ہیں۔ شہر شہر اور قصبے قصبے سینما درسِ عشق دے رہے ہیں۔ نہایت گندا لٹریچر آزادی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ بنی سنوری خواتین کھلے بندوں پھر رہی ہیں، زندگی کے ہر شعبے میں جنسی اختلاط کے مواقع بڑھ رہے ہیں اور نظامِ معاشرت نے اپنے بیہودہ رواجوں سے نکاح کو نہایت مشکل بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی سوسائٹی میں تو زنا کرنے والے کو سزا دینے کے بجائے زنا سے پرہیز کرنے والے کو انعام یا کم از کم خان بہادری کا خطاب ملنا چاہیے۔

شریعت کا قانونی حصّہ

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدید اصطلاح کے مطابق شریعت کے جس حصہ کو ہم قانون کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں وہ زندگی کی ایک مکمل اور جامع اسکیم کا ایک جزء ہے۔ یہ جزء بجائے خود کوئی مستقل چیز نہیں ہے کہ کل سے الگ کر کے اسے سمجھا یا جا سکے یا جاری کیا جا سکے۔ اگر ایسا کیا بھی جائے تو یہ اسلامی قانون کا اجرا نہ ہوگا، نہ اس سے وہ نتائج حاصل ہو سکیں گے جو اسلام کے پیش نظر ہیں اور نہ یہ حرکت خود شارع کے منشا کے مطابق ہوگی۔ شارع کا اصل منشا اپنی پوری اسکیم کو اجتماعی زندگی میں جاری کرنا ہے اور اس اسکیم کے مجموعی عمل درآمد ہی میں اسلامی قانون کا اجرا صحیح طور پر ہو سکتا ہے۔ شریعت کی یہ اسکیم عملی لحاظ سے کئی حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعض حصے ایسے ہیں جن کو نافذ کرنا ہر مومن کا اپنا کام ہے۔ کوئی خارجی طاقت ان کو نافذ نہیں کرا سکتی۔ بعض اور حصے ایسے ہیں جنھیں اسلام اپنے تزکیۂ نفس اور تربیتِ اخلاق اور تعلیم و تدریس کے پروگرام سے نافذ کراتا ہے۔ بعض دوسرے حصوں کو جاری کرنے کیلئے وہ رائے عامہ کی طاقت

استعمال کرتا ہے۔ بعض اور حصوں کو وہ مسلم سوسائٹی کے اصلاح یافتہ رواجوں کی شکل میں نافذ کرتا ہے اور ان سب کے ساتھ ایک بہت بڑا حصّہ ہے جسے نافذ کرنے کے لئے وہ تقاضا کرتا ہے کہ مسلم سوسائٹی اپنے اندر سیاسی اقتدار پیدا کرے، کیونکہ وہ اقتدار کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتا۔ یہ سیاسی اقتدار اس غرض کے لئے درکار ہے کہ شریعت کے تجویز کردہ نظامِ زندگی کی حفاظت کرے اس کو بگڑنے سے روکے۔ اس کی منشا کے مطابق بھلائیوں کی نشوونما اور برائیوں کے استیصال کا انتظام کرے اور اس کے ان احکام کو نافذ کرے جن کی تنفیذ کے لئے ایک نظامِ عدالت کا ہونا ضروری ہے۔

یہی آخری حصّہ وہ چیز ہے جسے ہم اسلامی قانون کے نام سے یاد کرتے ہیں اگرچہ ایک لحاظ سے پوری شریعت ہی قانون ہے کیونکہ وہ رعیت پر حاکم کا مقرر کیا ہوا مجموعۂ احکام ہے لیکن چونکہ اصطلاح میں "قانون" کا اطلاق ان احکام پر ہوتا ہے جو سیاسی اقتدار کے ذریعہ سے نافذ کئے جائیں۔ اس لئے ہم شریعت کے صرف اس حصّہ کو "قانونِ اسلام" قرار دیتے ہیں جسے نافذ کرنے کے لئے وہ خود اپنے اصول و مزاج کے مطابق ایک سیاسی اقتدار کی تشکیل چاہتی ہے۔

اسلامی قانون کے اہم شعبے

اس سیاسی اقتدار کی تشکیل کے لئے سب سے پہلے ایک دستوری قانون (CONSTITUTIONAL LAW) کی ضرورت ہے اور شریعت نے اس کے تمام ضروری اصول مقرر کر دئے ہیں۔ ریاست کا اساسی نظریہ کیا ہے؟ اس کے قیام کا مقصد کیا ہے؟ کون لوگ اس کے شہری ہو سکتے ہیں؟ ان کے حقوق اور واجبات کیا ہیں؟ کس بنیاد پر کسی کو حقوقِ شہریت ملتے اور کس بنا پر وہ سلب ہو سکتے ہیں؟ اسلامی ریاست میں غیر مسلم شہریوں (ذمیوں) کے حقوق و واجبات کیا ہیں؟

ریاست کے قانون اور اختیارات کا ماخذ کیا ہے؟ حکومت کا انتظام کن اصولوں پر چلایا جائے گا؟ انتظامی اختیارات کس کے سپرد کئے جائیں گے؟ اس کا تقرر کون کرے گا، کس کے سامنے وہ جواب دہ ہوگا، کن حدود کے اندر وہ کام کرے گا؟ قانون سازی کے اختیارات کس کو کس حد تک حاصل ہوں گے؟ عدالت کے حقوق و فرائض کیا ہوں گے؟ دستوری قانون کے ان تمام بنیادی مسائل کا واضح جواب شریعت نے ہم کو دیدیا ہے۔ پھر ان اصولوں کو صاف صاف متعین کرنے کے بعد وہ ہمیں آزاد چھوڑ دیتی ہے کہ دستور کی تفصیلی شکل وصورت ہم خود اپنے حالات اور ضروریات کے مطابق بنالیں۔ ہم اس امر کے پابند تو ضرور کئے گئے ہیں کہ اپنی ریاست کے دستور میں شریعت کے مقرر کئے ہوئے ان اصولوں پر قائم رہیں لیکن کوئی مفصل دستور ہر زمانے کے لئے ہم کو بنا کر نہیں دیا گیا ہے جس کے اندر فروعی ردّو بدل بھی جائز نہ ہو۔

تشکیل کے بعد اسلامی ریاست کو اپنا نظام چلانے کے لئے ایک انتظامی قانون (ADMINISTRATIVE LAW) کی ضرورت ہے، سو اس کے بھی تمام بنیادی اصول شریعت نے واضح کر دئے ہیں اور مزید برآں اس معاملہ میں ہماری رہنمائی کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی مثالی حکومت کے نظائر بھی موجود ہیں۔ ایک اسلامی ریاست اپنی آمدنی کے لئے کس قسم کے ذرائع اختیار کر سکتی ہے اور کس قسم کے ذرائع اختیار نہیں کر سکتی؟ حکومت کے واصلات میں کس قسم کے تصرفات درست ہیں اور کس قسم کے نادرست؟ فوج، پولیس، عدالت اور نظم و نسق کے مختلف شعبوں میں حکومت کا رویہ کیا ہونا چاہیئے؟ باشندوں کی اخلاقی اور مادی فلاح کے لئے حکومت پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں؟ کون سی بھلائیاں ہیں جنہیں قائم کرنے اور فروغ دینے کے لئے اسے کوشش کرنی چاہیئے اور کون سی برائیاں ہیں جنہیں روکنا اور دبانا اس کے فرائض میں سے ہے؟ باشندگان ملک کے معاملات زندگی میں حکومت کس حد تک دخل

انداز ہونے کی مجاز ہے؟ ان امور میں شریعت ہم کو محض اصولی ہدایات ہی نہیں دیتی بلکہ خاص خاص مسائل کے متعلق قطعی اور صریح احکام بھی دیتی ہے لیکن پورے نظم و نسق کے متعلق اس نے کوئی تفصیلی ضابطہ بنا کر ہمیں نہیں دیدیا ہے جسے ایک ہی شکل و صورت پر ہمیشہ اور ہر زمانے میں قائم رکھنے پر ہم مامور ہوں اور جس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کرنے کی ہمیں اجازت نہ ہو۔ دستوری قانون کی طرح انتظامی قانون میں بھی تفصیلی ضوابط بنانے کی پوری آزادی ہمیں حاصل ہے۔ البتہ اس آزادی کو ہم ان اصول اور حدود کے اندر ہی استعمال کر سکتے ہیں جو شریعت نے مقرر کر دئے ہیں۔ اس کے بعد اجتماعی قانون (PUBLIC LAW) اور شخصی قانون (PRIVATE LAW) کے وہ ابواب آتے ہیں جو معاشرے میں امن اور انصاف قائم کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ ان ابواب میں شریعت اتنے وسیع پیمانے پر ہمیں تفصیلی احکام اور اصولی ہدایات دیتی ہے کہ کسی دور میں اور معاملات زندگی کے کسی گوشے میں بھی ہم کو اپنی قانونی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے شرعی حدود سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آسکتی۔ جو تفصیلی احکام اس نے دئے ہیں وہ ابد تک ہر ملک اور ہر دور کی سوسائٹی میں یکساں صحت کے ساتھ جاری ہو سکتے ہیں (بشرطیکہ زندگی کا وہ مجموعی نظام بھی جس میں آپ ان احکام کو جاری کریں، اسلام کی ہدایت پر چل رہا ہو) اور جو اصولی ہدایات اس نے دی ہیں وہ اس قدر جامع ہیں کہ قریب قریب اکثر معاملات زندگی میں تمام فروری قوانین ان کی روشنی میں بنائے جا سکتے ہیں۔ پھر جن معاملات میں شریعت کسی قسم کے احکام اور ہدایات نہیں دیتی، ان میں خود شریعت ہی کی رو سے اسلامی ریاست کے اہل الرائے اور اصحاب حل و عقد باہمی مشورے سے قوانین بنانے کے مجاز ہیں اور جو اس طرح قوانین بنائے جائیں گے وہ قانون اسلام ہی کا ایک جز شمار ہوں گے، کیونکہ وہ شریعت کی دی ہوئی اجازت کے تحت بنائے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ہمارے فقہاء نے استحسان اور مصالح مرسلہ وغیرہ عنوانات کے تحت جو احکام مدون کئے تھے

وہ قانون اسلام ہی کے اجزا سمجھے گئے۔

سب سے آخر میں قانون کا ایک شعبہ وہ بھی ہے جس کی ایک ریاست کو اپنے بین الاقوامی تعلقات کے لئے ضرورت پیش آتی ہے اس باب میں شریعت نے جنگ اور صلح اور غیر جانبداری کی مختلف حالتوں کے متعلق اسلامی ریاست کا برتاؤ متعین کرنے کے لئے بہت تفصیلی ہدایات دی ہیں اور جہاں تفصیلات نہیں دی وہاں ایسے اصول دیدئے ہیں جن کی روشنی میں مزید تفصیلات مرتب کی جاسکتی ہیں۔

اسلامی قانون کا استقلال اور اس کی ترقی پذیری

اس مختصر تشریح سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ علم قانون کے جتنے شعبوں پر انسانی تصور آج تک پھیل سکا ہے ان میں سے کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں شریعت نے ہماری رہنمائی نہ کی ہو۔ یہ رہنمائی کس کس شکل میں کی گئی ہے اس کا اگر تفصیلی جائزہ لے کر دیکھا جائے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ اسلامی قانون میں کیا چیز قطعی اور مستقل ہے اور اس کے ایسا ہونے کا فائدہ کیا ہے اور کون سی چیز ابد تک ترقی پذیر ہے اور کس طریقہ سے ہر دور میں ہماری بڑھتی ہوئی تمدنی ضروریات کو پورا کر سکتی ہے۔

اس قانون میں جو چیز اٹل ہے وہ تین اجزا پر مشتمل ہے۔

(۱) قطعی اور صریح احکام جو قرآن یا ثابت شدہ احادیث میں دیئے گئے ہیں، مثلاً شراب اور سود اور قمار کی حرمت، چوری اور زنا اور قذف کی سزائیں اور میت کے ترکہ میں وارثوں کے حصے۔

(۲) اصول احکام جو قرآن اور ثابت شدہ احادیث میں بیان ہوئے ہیں، مثلاً یہ کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے یا یہ کہ لین دین کے جن طریقوں میں منافع کا تبادلہ آپس کی رضامندی سے نہ ہو وہ باطل ہیں یا یہ کہ مرد عورتوں پر قوام ہیں۔

(۳) حدود جو قرآن و سنت میں اس غرض کے لئے مقرر کی گئی ہیں کہ ہم اپنی آزادئ عمل کو ان کے اندر محدود رکھیں اور کسی حال میں ان سے تجاوز نہ کریں، مثلاً تعدادِ ازدواج کے لئے بیک وقت چار عورتوں کی حد یا طلاق کے لئے تین کی حد یا وصیت کیلئے ایک تہائی مال کی حد۔

اسلامی قانون کا یہ اٹل اور قطعی واجب الاطاعت حصّہ ہی دراصل وہ چیز ہے جو اسلامی تہذیب و تمدن کے حدودِ اربعہ اور اس کی مخصوص امتیازی شکل و صورت معین کرتا ہے آپ کسی ایسی تہذیب و تمدن کی نشاندہی نہیں کر سکتے جو اپنے اندر ایک ناقابل تغیّر و تبدّل عنصر رکھے بغیر اپنی ہستی اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھ سکے۔ اگر کسی تہذیب میں ایسا کوئی عنصر بھی نہ ہو اور سب ہی کچھ قابل ترمیم و تنسیخ ہو تو فی الحقیقت وہ سرے سے کوئی مستقل تہذیب ہی نہیں ہے۔ وہ ایک پگھلا ہوا مادّہ ہے جو ہر سانچے میں ڈھل سکتا ہے اور ہر وقت اپنی شکل بدل سکتا ہے۔

علاوہ بریں ان احکام اور اصول اور حدود کا تفصیلی مطالعہ کرنے سے ہر معقول آدمی اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ شریعت نے حکم جہاں بھی دیا ہے ایسے موقع پر دیا ہے جہاں انسانی قوتِ فیصلہ غلطی کر کے ”معروف“ سے ہٹ سکتی ہے۔ ایسے مواقع پر شریعت صاف حکم دے کر یا صریحاً منع کر کے یا اصول بتا کر یا حد لگا کر گویا نشانات راہ (SIGN POSTS) کھڑے کر دیتی ہے تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ صحیح راستہ کس طرف ہے۔ یہ نشانات ہماری رفتار ترقی کو روکنے والے نہیں ہیں بلکہ ہمیں سیدھی راہ پر لگانے اور ہمارے سفر زندگی کو بے راہ روی سے بچانے کے لئے ہیں۔ ان مستقل قوانین کا معتدبہ حصّہ ایسا ہے جن پر کل تک دنیا اعتراض کر رہی تھی۔ مگر ہمارے دیکھتے دیکھتے تجربات اور تلخ تجربات نے کل کے معترضین کو آج معترف بنا دیا ہے اور ان ہی قوانین کی خوشہ چینی پر وہ مجبور ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر میں صرف اسلام کے قانون ازدواج اور قانون میراث کی

طرف اشارہ کافی سمجھتا ہوں۔

اس پائدار اور اٹل عنصر کے ساتھ ایک دوسرا عنصر ایسا ہے جو اسلامی قانون میں بے اندازہ وسعت پیدا کرتا ہے اور اسے زمانہ کے تمام بدلتے ہوئے حالات میں ترقی پذیر بناتا ہے۔ یہ عنصر کئی اقسام پر مشتمل ہے۔

(۱) تعبیر یا تاویل احکام، یعنی کوئی حکم جن الفاظ میں دیا گیا ہو ان کا مفہوم سمجھنے اور ان کا منشا متعین کرنے کی کوشش کرنا۔ یہ فقہ اسلامی کا ایک بہت ہی وسیع باب ہے۔ قانونی دماغ اور نکتہ رس نگاہ رکھنے والے لوگ جب کتاب و سنّت میں غور و خوض کرتے ہیں تو وہ شریعت کے صریح احکام میں بھی مختلف تعبیرات کی گنجائش پاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے فہم و بصیرت کے مطابق کسی ایک تعبیر کو بدلائل دوسری تعبیروں پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ تعبیر اختلاف پہلے بھی امت کے اہل علم میں رہا ہے آج بھی ہو سکتا ہے اور آئندہ بھی یہ دروازہ کھلا رہے گا۔

(۲) قیاس، یعنی جس معاملہ میں کوئی صاف حکم نہ ملتا ہو اس پر کسی ایسے حکم کو جاری کرنا جو اس سے ملتے جلتے کسی معاملہ میں دیا گیا ہو۔

(۳) اجتہاد، یعنی شریعت کے اصولی احکام اور جامع ہدایات کو سمجھ کر ایسے معاملات پر ان کو منطبق کرنا جن میں نظائر بھی نہ ملتے ہوں۔

(۴) استحسان، یعنی مباحات کے غیر محدود دائرے میں حسب ضرورت ایسے قوانین اور ضوابط وضع کرنا جو اسلام کے مجموعی نظام کی روح سے زیادہ سے زیادہ مطابقت رکھتے ہوں۔

یہ چاروں چیزیں ایسی ہیں جن کے امکانات پر اگر کوئی شخص غور کرے تو وہ کبھی اس شبہ میں نہیں پڑ سکتا کہ اسلامی قانون کا دامن کسی وقت بھی انسانی تمدن کی روز افزوں ضروریات اور متغیر حالات کے لئے تنگ ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھئے کہ اجتہاد

واستحسان ہو یا تعبیر و قیاس، بہرحال اس کا مجاز ہر کس و ناکس نہیں ہو سکتا۔ آپ ہر راہ رو کا یہ حق تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ موجودہ ملکی قانون کے کسی مسئلہ پر فیصلہ صادر کر دے اس کے لئے قانونی تعلیم اور ذہنی تربیت کا ایک خاص معیار آپ کے نزدیک بھی ناگزیر ہے جس پر پورا اترے بغیر کوئی شخص ماہرانہ رائے زنی کا اہل نہیں مانا جا سکتا۔ اسی طرح اسلامی قانون کے مسائل پر بھی رائے زنی کا حق صرف انہیں لوگوں کو دیا جا سکتا ہے جنہوں نے اس کی ضروری اہلیت بہم پہنچائی ہو۔ تعبیر احکام کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اس زبان کی نزاکتوں سے واقف ہو جس میں احکام دئے گئے ہیں۔ ان حالات سے واقف ہو جن میں ابتداً یہ احکام دئے گئے تھے۔ قرآن کے انداز بیان کو اچھی طرح سمجھتا ہو اور حدیث کے ذخیرے پر وسیع نگاہ رکھتا ہو۔ قیاس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اتنی لطیف قانونی حس رکھتا ہو کہ ایک معاملہ کو دوسرے معاملہ پر قیاس کرتے ہوئے ان کی مماثلت کے پہلوؤں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ سکے ورنہ ایک کا حکم دوسرے پر منطبق کرنے میں وہ غلطی سے نہیں بچ سکتا۔ اجتہاد کے لئے شریعت کے احکام میں گہری بصیرت اور معاملات زندگی کا عمدہ فہم محض عام فہم ہی نہیں بلکہ اسلامی نقطۂ نظر سے فہم درکار ہے۔ استحسان کے لئے بھی ناگزیر ہے کہ آدمی اسلام کے مزاج اور اسکے نظام زندگی کو اچھی طرح سمجھتا ہو تاکہ مباحات کے دائرے میں جو قوانین اور ضوابط وہ تجویز کرے وہ اس نظام زندگی کے مجموعہ میں صحیح طور پر جذب ہو سکیں۔ ان علمی اور ذہنی صلاحیتوں سے بڑھ کر ایک اور چیز بھی درکار ہے۔ جس کے بغیر اسلامی قانون کا ارتقاء کبھی صحیح خطوط پر نہیں ہو سکتا اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ اس کام کو انجام دیں ان کے اندر اسلام کی پیروی کا ارادہ اور خدا کے سامنے اپنی جوابدہی کا احساس موجود ہو۔ یقیناً یہ کام ان لوگوں کے کرنے کا نہیں ہے جو خدا اور آخرت سے بے پرواہ ہو کر محض دنیوی مصلحتوں پر نگاہ جما چکے ہوں اور اسلامی قدروں کو چھوڑ کر کسی دوسری تہذیب کی قدریں پسند کر چکے ہوں۔ ایسے لوگوں کے ہاتھوں اسلامی قانون کا ارتقاء نہیں ہو سکتا، صرف اس میں تحریف ہو سکتی ہے۔

اعتراضات اور جوابات

اب میں مختصر طور پر ان اعتراضات سے بحث کروں گا جو پاکستان میں اسلامی قانون کے اجراء کا مطالبہ سن کر بالعموم کئے جاتے ہیں یہ اعتراضات بظاہر تو بہت سے ہیں، اس لئے کہ ان کے بیان کرنے میں الفاظ کی فضول خرچی ذرا دل کھول کر کی جاتی ہے لیکن سب کا تجزیہ کرنے سے اصل اعتراض صرف چار نکلتے ہیں۔

تہمت بوسیدگی

پہلا اعتراض یہ ہے کہ صدیوں کا پرانا قانون جدید زمانے کی ایک سوسائٹی اور اسٹیٹ کی ضروریات کے لئے کس طرح کافی ہو سکتا ہے؟

جن حضرات کی طرف سے یہ اعتراض پیش کیا جاتا ہے مجھے شبہ ہے کہ وہ اسلامی قانون کے متعلق ابتدائی اور سرسری واقفیت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ غالباً انہوں نے کہیں سے بس یہ اُڑتی اُڑاتی خبر سن لی ہے کہ اس قانون کے بنیادی احکام اور اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے بیان ہوئے تھے اس کے بعد یہ بات انہوں نے بطور خود فرض کر لی کہ اس وقت سے یہ قانون جوں کا توں اسی حالت میں رکھا ہوا ہے۔ اسی بنا پر انہیں یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ اگر آج ایک جدید ریاست اسے اپنا ملکی قانون بنا لے تو وہ اسکی وسیع ضروریات کے لئے کیسے کافی ہو سکے گا۔ ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ جو بنیادی احکام و اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے دئے گئے تھے ان پر اسی وقت ایک ریاست قائم ہو گئی تھی اور روزمرہ پیش آنے والے معاملات میں تعبیر و قیاس اور اجتہاد و استحسان کے ذریعہ سے اس قانون کا ارتقاء اوّل روز ہی سے شروع ہو گیا تھا پھر اسلامی اقتدار وسیع ہو کر بحر الکاہل سے بحر اوقیانوس تک آدھی سے زیادہ مہذب دنیا پر پھیل گیا اور جتنی ریاستیں

بھی بعد کے بارہ سو سال میں مسلمانوں نے قائم کیں۔ ان سب کا پورا انتظام و نسق اسی قانون پر چلتا رہا۔ ہر دور اور ہر ملک کے حالات و ضروریات کے مطابق اس قانون میں مسلسل توسیع ہوتی رہتی ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کی ابتدا تک اس ارتقاء کا ایک سلسلہ ایک دن کے لئے بھی نہیں رکا ہے۔ خود آپ کے اس ملک میں بھی انیسویں صدی کے اوائل تک اسلام ہی کا دیوانی اور فوجداری قانون جاری رہا ہے۔ اب زیادہ سے زیادہ صرف سو سال کا وقفہ ایسا رہ جاتا ہے جس کے متعلق آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں اسلامی قانون پر عمل درآمد بند رہا اور اس کا ارتقاء رکا رہا لیکن اول تو یہ وقفہ کچھ اتنا زیادہ بڑا نہیں ہے کہ ہم تھوڑی محنت و کاوش سے اس کے نقصان کی تلافی نہ کر سکیں دوسرے ہمارے پاس ہر صدی کی فقہی ترقیات کا پورا ریکارڈ موجود ہے جسے دیکھ کر ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ ہمارے اسلاف پہلے کتنا کام کر چکے ہیں اور آگے ہمیں کیا کام کرنا ہے۔ پھر جن بنیادوں پر اسلامی قانون کا ارتقا ہوتا ہے انہیں دیکھتے ہوئے کوئی صاحب علم آدمی اس امر میں شک نہیں کر سکتا کہ جس طرح پچھلی بارہ صدیوں میں یہ قانون ہر دور اور ہر ملک کی ضروریات کے مطابق وسیع ہوتا رہا ہے اسی طرح موجودہ صدی میں بھی ہو سکتا ہے اور آئندہ صدیوں میں بھی ہوتا رہے گا۔ ناواقف لوگ اس کو جانے بغیر ہر قسم کے وسوسوں میں پڑ سکتے ہیں مگر جو لوگ اس کو جانتے ہیں اس کے امکانات سے واقف ہیں اور اس کی تاریخ پر نظر رکھتے ہیں، انھیں ایک لمحہ کے لئے بھی اس پر تنگ دامانی کا شبہ نہیں ہو سکتا۔

الزام وحشت

دوسرا اعتراض جو پبلک میں تو دبی زبان سے مگر نجی صحبتوں میں بڑی کافرانہ جسارتوں کے ساتھ کیا جاتا ہے یہ ہے کہ اسلامی قانون میں بہت سی چیزیں قرونِ وسطیٰ کی تاریک خیالی کے باقیات میں سے ہیں جنہیں اس مہذب دور کے ترقی یافتہ اخلاقی تصورات

کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے۔ مثلاً ہاتھ کاٹنے اور دُرّے مارنے اور سنگسار کرنے کی وحشیانہ سزائیں۔

یہ اعتراض سُن کر بے اختیار ان حضرات سے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ:

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

جس دَور میں ایٹم بم کا استعمال کیا گیا ہے اس کے اخلاقی تصورات کو ترقی یافتہ کہتے وقت آدمی کو کچھ تو شرم محسوس ہونی چاہیئے۔ آج کا نام نہاد مہذب انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ جو سلوک کر رہا ہے اس کی مثال تو قدیم تاریخ کے کسی تاریک سے تاریک دَور میں بھی نہیں ملتی۔ وہ سنگسار نہیں بم بار کرتا ہے، محض ہاتھ ہی نہیں کاٹتا، جسم کے پرخچے اڑا دیتا ہے۔ دُرّے برسانے سے اس کا دل نہیں بھرتا زندہ آگ میں جلاتا ہے اور مردہ لاشوں کی چربی نکال کر ان کے صابن بناتا ہے۔ جنگ کے ہنگامۂ غیض و غضب ہی میں نہیں، امن کے ٹھنڈے ماحول میں بھی جن کو وہ سیاسی مجرم یا قومی مفاد کا دشمن یا معاشی اغراض کا حریف سمجھتا ہے ان کو دردناک عذاب دینے میں وہ آخر کون سی کسر اٹھا رکھتا ہے؟ ثبوت جرم سے پہلے محض شبہ ہی شبہ میں تفتیش کے جو طریقے اور اقبال جرم کرانے کے جو ہتھکنڈے آج کی مہذب حکومتوں میں اختیار کیئے جا رہے ہیں وہ کس سے چھپے ہوئے ہیں۔ ان ساری باتوں کی موجودگی میں یہ دعویٰ تو کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ آج کے نام نہاد ترقی یافتہ تصورات انسان کو انسان کے ہاتھوں عذاب پاتے ہوئے دیکھنا سرے سے گوارا ہی نہیں کرتے۔ گوارا تو وہ کر رہے ہیں اور پہلے سے زیادہ سخت عذابوں کو گوارا کر رہے ہیں۔ البتہ فرق جو کچھ واقع ہوا وہ دراصل اخلاقی قدروں میں ہے۔ ان کے نزدیک جو جرائم واقعی سخت ہیں ان پر وہ خوب عذاب دیتے ہیں اور دل کھول کر دیتے ہیں۔ مثلاً ان کے سیاسی اقتدار کو چیلنج کرنا یا ان کے معاشی مفاد میں مزاحم ہونا لیکن وہ جن افعال کو سرے سے

جرم ہی نہیں سمجھتے مثلاً شراب سے ایک گونا بے خودی حاصل کر لینا یا تفریحاً زنا کر لینا، ان پر عذاب تو در کنار، سرزنش اور ملامت بھی انہیں ناگوار ہوتی ہے اور جرم نہ سمجھنے کی صورت میں لامحالہ وہ ناگوارِ خاطر ہونی ہی چاہئے۔

اب میں ان معترضین سے پوچھتا ہوں کہ آپ کن اخلاقی قدروں کے قائل ہیں؟ اسلام کی اخلاقی قدریں؟ یا موجودہ تہذیب کی؟ اگر آپ کی قدریں بدل چکی ہیں، اگر حلال و حرام اور خطا و صواب اور نیکی و بدی کے وہ معیار آپ چھوڑ چکے ہیں جو اسلام نے مقرر کئے تھے اور دوسرے معیار آپ نے دل سے قبول کر لئے ہیں تو پھر اسلام کے دائرے میں آپکی جگہ کہاں، کہ آپ اس کے قوانین میں ترمیم کی گفتگو چھیڑیں آپ کا مقام اندر نہیں باہر ہے۔ اپنی ملت الگ بنائیے کوئی اور نام اپنے لئے تجویز کیجئے اور صاف صاف یوں کہئے کہ ہم اسلام کو بحیثیت ایک دین کے رد کرتے ہیں۔ جس خدا کی مقرر کی ہوئی سزاؤں کو آپ وحشیانہ سمجھتے ہیں ان پر ایمان لانے کا آخر کس احمق نے آپ کو مشورہ دیا ہے اور کون احمق یہ باور کر سکتا ہے کہ اس کی بات کو وحشیانہ کہنے کے بعد آپ اس پر ایمان بھی رکھتے ہیں۔

فقہی اختلافات کا بہانہ

تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اسلام میں بہت سے فرقے ہیں اور ہر فرقہ کی فقہ جدا ہے اب اگر یہاں اسلامی قانون جاری کرنے کا فیصلہ کیا جائے تو آخر وہ کس فرقہ کی فقہ کے مطابق ہوگا۔

یہ وہ اعتراض ہے جس پر اسلامی قانون کے مخالفین بڑی امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ وہ توقع رکھتے ہیں کہ آخر کار اسی سوال پر مسلمانوں میں پھوٹ ڈال کر وہ اسلام کے خطرے کو ٹال سکیں گے۔ خود مسلمانوں میں وہ لوگ جو حقیقت سے پوری طرح واقف نہیں ہیں اس سوال پر اکثر پریشان ہو جاتے ہیں کہ اس پیچیدگی کو آخر کیسے حل کیا جائے گا۔

حالانکہ درحقیقت یہ سرے سے کوئی پیچیدگی ہے ہی نہیں اور پچھلی بارہ صدیوں میں اس مسئلے نے کبھی اور کہیں اسلامی قانون کے نفاذ کو نہیں روکا ہے۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ اسلامی قانون کا ڈھانچہ جو خدا اور رسول کے مقرر کیے ہوئے قطعی احکام اور اصول اور حدود پر مشتمل ہے۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں ابتدا سے آج تک یکساں مسلم رہا ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہ پہلے تھا، نہ اب پایا جاتا ہے۔ فقہی اختلافات جتنے بھی ہوئے ہیں، تعبیرات احکام میں قیاسی و اجتہادی مسائل میں اور دائرہ اباحت کے قوانین و ضوابط میں ہوئے ہیں۔

پھر ان اختلافات کی حقیقت بھی یہ ہے کہ کسی حکم کی کوئی تعبیر جو کسی عالم نے کی ہو یا کوئی مسئلہ جو قیاس و اجتہاد سے کسی امام نے نکالا ہو یا کوئی فتوی جو استحسان کی بنا پر کسی مجتہد نے دیا ہو، بجائے خود قانون نہیں بن جاتا۔ در اصل اس کی حیثیت محض ایک تجویز کی ہوتی ہے۔ قانون وہ صرف اسی وقت بنتا ہے جب کہ اس پر اجماع (اتفاق رائے) ہو جائے یا جمہور (اکثریت) اس کو تسلیم کر لیں اور فتوے اسی پر جاری ہو جائے۔ ہمارے فقہاء جب اپنی کتابوں میں کسی مسئلے کو بیان کرنے کے بعد لکھا کرتے ہیں کہ علیه الاجماع یا علیه الجمهور اور علیه الفتویٰ تو اس سے ان کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس مسئلے کے متعلق یہ رائے اب محض رائے یا تجویز نہیں رہی ہے بلکہ اتفاق رائے یا جمہوری فیصلے کی بنا پر اب یہ قانون بن چکی ہے۔

یہ اجماعی اور جمہوری فیصلے بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن پر تمام امت کا ہمیشہ اجماع رہا ہے۔ یا دنیائے اسلام کی اکثریت نے جن کو قبول کر لیا ہے۔ دوسرے وہ جن پر کسی وقت کسی ملک کے مسلمانوں کا اجماع ہو جائے یا ان کی اکثریت انہیں قبول کر لے۔

پہلی قسم کے فیصلے اگر اجماعی ہوں تو وہ نظر ثانی کے قابل نہیں ہیں انہیں تمام مسلمانوں کو بحیثیت ایک قانون کے قبول کرنا ہوگا اور اگر وہ جمہوری فیصلے ہوں تو ان کے متعلق یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم جس ملک میں اسلامی قانون جاری کر رہے ہیں اس کی اکثریت بھی انہیں تسلیم کرتی ہے یا نہیں ؟ اگر اکثریت انہیں تسلیم کرتی ہو تو وہ ملک کا قانون قرار پائیں گے ۔

یہ حیثیت تو پچھلے فقہی احکام کی ہے ۔ رہا آئندہ کا معاملہ، تو آگے پیش آنے والے معاملات میں حکم خدا اور رسول کی جس تعبیر یا جس قیاس و اجتہاد اور جس استحسان پر ہمارے ملک کے اصحاب حل و عقد کا اجماع ہو جائے گا یا ان کی اکثریت اس کو اختیار کرے گی ۔ وہ ہمارے ملک کے لئے قانون ہوگا پہلے بھی ہر مسلمان ملک کا قانون ایسے ہی فتاوی پر مشتمل ہوتا تھا ۔ جو ملک کی تمام یا اکثر آبادی کے نزدیک مسلم ہوتے تھے، اور آج بھی صرف یہی ایک صورت قابلِ عمل ہے ۔ میں نہیں سمجھتا کہ جمہوریت کے اصول پر اس کے سوا اور کون سی صورت تجویز کی جا سکتی ہے ۔

اب رہا یہ سوال کہ مسلمانوں کے جو گروہ اکثریت کے ساتھ متفق نہ ہوں ان کی پوزیشن کیا ہوگی ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے قلیل التعداد گروہ پرسنل لا کی حد تک اپنی فقہ کو اپنے معاملات میں جاری کرنے کا مطالبہ کر سکتے ہیں اور یہ حق ان کو ضرور ملنا چاہیئے لیکن قانونِ ملکی (LAW OF THE LAND) بہر حال وہی ہوگا اور وہی ہو سکتا ہے جو اکثریت کے مسلک پر مبنی ہو ۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ آج مسلمانوں کا کوئی فرقہ بھی یہ غیر معقول بات کہنے کے لئے تیار نہ ہوگا کہ اسلامی قانون میں ہم متفق نہیں ہیں ۔ لہٰذا یہاں کفر کا قانون جاری ہونا چاہیئے اسلام میں اختلاف کر کے سب مسلمانوں کا کفر پر متفق ہو جانا ایک ایسی بیہودہ بات ہے جو چند کفر پسند افراد کو چاہے کتنی ہی پسند ہو، بہر حال کسی فرقے کا مسلمان بھی اسے اپنے دل میں جگہ دینے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا ۔

غیر مسلم اقلیتوں کا مسئلہ

آخری اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس ملک میں صرف مسلمان ہی نہیں رہتے بلکہ غیر مسلم بھی آباد ہیں وہ کس طرح یہ گوارا کر لیں گے کہ مسلمانوں کا مذہبی قانون ان پر مسلّط ہو جائے؟

یہ اعتراض جو لوگ پیش کرتے ہیں وہ دراصل اس مسئلہ پر محض ایک سطحی نگاہ ڈالتے ہیں۔ انہوں نے پوری طرح سے اس کا تجزیہ نہیں کیا ہے اسی لئے ان کو اس میں بڑی پیچیدگی نظر آتی ہے حالانکہ تھوڑی سی تحلیل کرنے کے بعد اس کی ساری الجھنیں خود ہی سلجھتی چلی جاتی ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ ہم جس قانون پر بحث کر رہے ہیں وہ قانون ملکی ہے نہ کہ قانون شخصی، جہاں تک شخصی معاملات کا تعلق ہے ان کے بارے میں تو یہ مسلّم ہے کہ ہر گروہ پر اس کا اپنا قانون ہی جاری ہوگا۔ یہ حق دنیا میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ فیاضی کے ساتھ اسلام نے اہل الذمّہ کو دیا تھا، بلکہ درحقیقت وہ اسلام ہی ہے جس سے موجودہ دور کے اہلِ قانون نے ملکی قانون اور شخصی قانون کا فرق سیکھا ہے اور یہ اصول معلوم کیا ہے کہ جس ریاست کی آبادی مختلف المذاہب لوگوں پر مشتمل ہو اس میں سب گروہوں کے شخصی معاملات ان کے شخصی قوانین ہی کے تحت ہونے چاہئیں۔ لہٰذا کسی غیر مسلم اقلیت کو ہم سے یہ اندیشہ تو ہونا ہی نہ چاہیئے کہ ہم ان کے شخصی معاملات پر اپنے مذہبی قوانین کو مسلّط کر کے اس قاعدے کی خلاف ورزی کریں گے جو دراصل ہمارا اپنا ہی قائم کیا ہوا قاعدہ ہے اور جس کے متعلق اسلام نے ہم کو قطعی و واضح احکام دے رکھے ہیں۔

اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اس ملک میں قانون ملکی کون سا ہو؟

انصاف کی رُو سے اس سوال کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ قانون ملکی

وہی ہونا چاہئے جو اکثریت کے نزدیک صحیح ہو۔ اقلیت ہم سے اپنا جائز حق ضرور مانگ سکتی ہے اور وہ ہم اس کے مانگنے سے پہلے ہی تسلیم کر رہے ہیں۔ لیکن وہ ہم سے یہ مطالبہ کس طرح کر سکتی ہے کہ اس کو راضی کرنے کے لئے ہم خود اپنے عقیدے کی نفی کریں اور کسی ایسے قانون کو اپنے ہاتھوں جاری کرنے لگیں جس کو ہم حق نہیں سمجھتے۔ جب تک ہم اپنے ملک میں خود مختار نہ تھے ہمیں مجبوراً ایک باطل قانون کو گوارا کرنا پڑا۔ اس کی ذمہ داری سے ہم بری ہو سکتے ہیں۔ لیکن اب جب کہ اختیارات ہمارے اپنے ہاتھ میں ہیں۔ اگر ہم جان بوجھ کر اسلامی قانون کی جگہ کوئی دوسرا قانون جاری کریں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم قومی حیثیت سے بالارادہ مرتد ہو رہے ہیں، کیا فی الواقع کسی اقلیت کا ہم پر یہ حق ہے کہ اس کے خاطر ہم اپنا دین بدلنا گوارا کر لیں ؟ کوئی اقلیت کسی بااختیار اکثریت سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے کہ وہ اپنی رائے میں جس چیز کو صحیح سمجھتی ہو اسے چھوڑ دے اور وہ چیز اختیار کرے جسے اقلیت صحیح سمجھتی ہو؟ یا پھر کیا یہ کوئی معقول اصول ہے کہ جس ملک میں مختلف المذاہب لوگ آباد ہوں اس میں سب کو لا مذہب ہی ہو کر رہنا چاہئے؟ اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں نہیں ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ آخر ایک مسلمان اکثریت کے ملک میں اسلامی قانون کیوں ملکی قانون قرار نہ پائے۔

پاکستان میں اسلامی قانون کا نفاذ

کس طرح ہو سکتا ہے

اس سے پہلے میں آپ کے سامنے ایک تقریر اس موضوع پر کر چکا ہوں کہ اسلامی قانون کی حقیقت کیا ہے، اس کی روح اور اس کا مقصد کیا ہے، اس کے بنیادی اصول کیا ہیں، مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا اس کے ساتھ تعلق کیا ہے اور ہم کیوں اپنے ملک میں اسے نافذ کرنے کے پابند ہیں اور وہ شبہات کیا وزن رکھتے ہیں جو اس کے بارے میں عام طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ میری وہ تقریر محض ایک تعارفی تقریر تھی۔ اب میں ذرا

تفصیل کے ساتھ اس مسئلے پر بحث کرنا چاہتا ہوں کہ اگر اب ہم اس ملک میں اسلامی قانون کو ازسرِنو جاری کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کے لئے کیا تدبیریں کرنی ہوں گی۔

فوری انقلاب نہ ممکن ہے نہ مطلوب

اس سلسلے میں سب سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس غلط فہمی کو دور کر دوں جو اسلامی قانون کے اجراء کے متعلق کثرت سے لوگوں کے ذہن میں پائی جاتی ہے لوگ جب سنتے ہیں کہ ہم یہاں اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس حکومت میں ملک کا قانون اسلامی قانون ہوگا تو انہیں یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید نظامِ حکومت کے تغیّر کا اعلان ہوتے ہی تمام پچھلے قوانین یک لخت منسوخ ہو جائیں گے اور اسلامی قانون بیک وقت نافذ کر دیا جائے گا — یہ غلط فہمی صرف عام لوگوں ہی میں نہیں پائی جاتی بلکہ اچھے خاصے مذہبی طبقے بھی اس میں مبتلا ہیں۔ ان کے نزدیک ایسا ہونا ہی چاہئے کہ ادھر اسلامی حکومت قائم ہو اور ادھر فوراً ہی غیر اسلامی قوانین کا نفاذ بند اور اسلامی قانون کا نفاذ شروع ہو جائے درحقیقت یہ لوگ اس بات کو بالکل نہیں سمجھتے کہ ایک ملک کا قانون اس کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے۔ انہیں معلوم نہیں ہے کہ جب تک کسی ملک کا نظامِ زندگی اپنے سارے شعبوں کے ساتھ نہ بدلے اس کے قانونی نظام کا بدل جانا ممکن نہیں ہے انہیں اس کا بھی اندازہ نہیں ہے کہ پچھلے سوڈیڑھ سو برس سے ہم پر جو انگریزی اقتدار مسلط رہا ہے اس نے کس طرح ہماری زندگی کے پورے نظام کو اسلامی اصولوں سے ہٹا کر غیر اسلامی اصولوں پر چلا دیا ہے اور اب اسے پھر بدل کر دوسری بنیادوں پر قائم کرنا کتنی محنت، کتنی کوشش اور کتنا وقت چاہتا ہے۔ یہ لوگ عملی مسائل میں بصیرت نہیں رکھتے۔ اس لئے اجتماعی نظام کی تبدیلی کو ایک کھیل سمجھتے ہیں اور ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا خواب دیکھتے ہیں پھر ان کی یہی باتیں ان لوگوں کو جو اسلامی نظام سے فرار کی راہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ یہ موقع

دے دیتی ہیں کہ وہ اس تخیل کا مذاق اڑائیں اور اس کے حامیوں کا استخفاف کریں۔

بتدریج کا اصول

اگر ہم فی الواقع اپنے اس تخیل کو کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں فطرت کے اس اٹل قاعدے سے غافل نہ ہونا چاہئے کہ اجتماعی زندگی میں جتنے تغیرات بھی ہوتے ہیں بتدریج ہی ہوا کرتے ہیں۔ انقلاب جتنا اچانک اور جس قدر یک رخا ہوگا اتنا ہی وہ ناپائیدار ہوگا۔ ایک مستحکم اور پائندہ انقلاب کے لئے یہ بالکل ضروری ہے کہ وہ زندگی کی ہر جہت اور ہر پہلو میں پورے توازن کے ساتھ کارفرما ہو تاکہ اس کا ہر گوشہ دوسرے گوشے کو سہارا دے سکے۔

عہد نبوی کی مثال

اس کی بہترین مثال خود وہ انقلاب ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں برپا کیا تھا۔ جو شخص حضورؐ کے کارنامے سے تھوڑی سی واقفیت رکھتا ہے اسے بھی معلوم ہے کہ آپ نے پورا اسلامی قانون اپنے سارے شعبوں کے ساتھ بیک وقت نافذ نہیں کر دیا تھا بلکہ معاشرے کو بتدریج اس کے لئے تیار کیا تھا اور اس تیاری کے ساتھ آہستہ آہستہ سابق جاہلیت کے طریقوں اور قاعدوں کو بدل کر نئے اسلامی طریقے اور قاعدے جاری کئے تھے۔ آپ نے سب سے پہلے اسلام کے بنیادی تصورات اور اخلاقی اصول لوگوں کے سامنے پیش کئے پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کرتے گئے انہیں آپ تربیت دے کر ایک ایسا مسلح گروہ تیار کرتے چلے گئے جس کا ذہن اور زاویۂ نظر اور طرزِ عمل خالص اسلامی تھا۔ جب یہ کام ایک خاص حد تک پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تو آپ نے دوسرا قدم اٹھایا اور وہ یہ تھا کہ مدینے میں ایک ایسی حکومت قائم کر دی جو خالص اسلامی نظریہ پر مبنی تھی اور جس کا مقصد ہی یہ تھا کہ ملک کی زندگی کو اسلام کے نقشے پر ڈھال دے۔ اس طرح سیاسی طاقت اور ملکی ذرائع کو ہاتھ میں لے کر نبی صلی اللہ

علیہ وسلم نے وسیع پیمانے پر اصلاح و تعمیر کا وہ کام شروع کیا جس کے لئے آپ پہلے صرف دعوت و تبلیغ کے ذریعہ سے کوشش فرما رہے تھے آپ نے ایک مرتب اور منظم طریقے سے لوگوں کے اخلاق، معاشرت، تمدن اور معیشت کو بدلنے کی جد و جہد کی۔ تعلیم کا ایک نیا نظام قائم کیا جو اس زمانے کے حالات کے لحاظ سے زیادہ تر زبانی تلقین کے طریقے پر تھا۔ جاہلیت کے خیالات کی جگہ اسلامی طرز فکر کی اشاعت کی۔ پرانی رسموں اور طور طریقوں کی جگہ نئے اصلاح یافتہ رواج اور آداب و اطوار جاری کئے اور اس ہمہ گیر اصلاح کے ذریعہ سے جوں جوں زندگی کے مختلف گوشوں میں انقلاب و نما ہوتا گیا آپ اسی کے مطابق پورے توازن اور تناسب کے ساتھ اسلامی قانون کے احکام جاری کرتے چلے گئے یہاں تک کہ نو سال کے اندر ایک طرف اسلامی زندگی کی تعمیر مکمل ہوئی اور دوسری طرف پورا اسلامی قانون ملک میں نافذ ہو گیا۔

قرآن اور حدیث کے غائر مطالعے سے ہمیں واضح طور پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ نے یہ کام کس ترتیب و تدریج کے ساتھ کیا تھا۔ وراثت قانون ۳ھ میں جاری کیا گیا۔ نکاح و طلاق کے قوانین رفتہ رفتہ ۷ھ میں جا کر مکمل ہوئے۔ فوجداری قوانین کئی سال تک ایک ایک دفعہ کر کے نافذ کئے جاتے رہے۔ یہاں تک کہ ۸ھ میں ان کی تکمیل ہوئی۔ شراب کی بندش کے لئے بتدریج فضا تیار کی گئی اور ۸ھ میں اس کا قطعی انسداد کر دیا گیا۔ سود کی برائی اگرچہ مکہ ہی میں صاف صاف بیان کی جا چکی تھی۔ مگر اسلامی حکومت قائم ہوتے ہی اسے یک لخت بند نہیں کر دیا گیا۔ بلکہ ملک کے پورے معاشی نظام کو بدل کر جب نئے سانچوں میں ڈھال لیا گیا تب کہیں ۹ھ میں سود کی قطعی حرمت کا قانون جاری کیا۔ یہ کام بالکل ایک معمار کا سا کام تھا جس نے اپنے پیش نظر نقشے کی عمارت بنانے کے لئے کاریگر اور مزدور جمع کئے ذرائع و وسائل مہیا کئے، زمین ہموار کی، بنیادیں کھودیں، پھر ایک ایک اینٹ رکھ کر ہر جہت سے عمارت کو اٹھاتا ہوا اوپر لے گیا اور چند سال کی مسلسل محنت کے بعد آخر کار وہ عمارت مکمل کر دی جس کا خاکہ اس کے ذہن میں تھا۔

انگریزی دور کی مثال

قریب کے زمانے میں خود ہمارے ملک پر جب انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تھی تو کیا انہوں نے یک لخت یہاں کا سارا نظام بدل ڈالا تھا؟ نہیں ان کی حکومت سے پہلے چھ سات سو برس سے یہاں کا پورا نظام زندگی اسلامی فقہ پر چل رہا تھا۔ اس صدیوں کی جمع ہوئی عمارت کو ڈھا دینا اور مغربی اصول و نظریات کے مطابق ایک دوسرے نظام کی عمارت کھڑی کر دینا ایک دن کا کام نہ تھا۔ تاریخ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی اقتدار قائم ہونے کے بعد بھی ایک مدت تک ہندوستان میں فقہ اسلامی ہی رائج رہی۔ عدالتوں میں قاضی ہی انصاف کے لئے بیٹھتے تھے، اور اسلام کا قانون صرف پرسنل لا کی حد تک محدود نہ تھا۔ بلکہ وہی ملکی قانون (LAW OF THE LAND) بھی تھا۔ انگریزوں کو یہاں کا قانونی نظام بدلتے بدلتے ایک صدی لگ گئی۔ انہوں نے بتدریج یہاں کا نظام بدل کر اپنے مطلب کے آدمی ڈھالے۔ اپنے خیالات کی اشاعت سے ذہنیتیں بدلیں، اپنے اقتدار کے اثر سے لوگوں کے اخلاق بدلے، اپنی بالادستی کے زور سے معاشی نظام بدلا اور پھر جیسے جیسے یہ مختلف قسم کے ہمہ گیر اثرات یہاں کی اجتماعی زندگی کو بدلتے گئے اسی کے مطابق پرانے قوانین منسوخ اور نئے قوانین جاری ہوتے چلے گئے۔

تدریج ناگزیر ہے

اب اگر ہم یہاں پھر اسلامی قانون جاری کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے بھی انگریزی حکومت کے صد سالہ نقوش کو کھرچ دینا اور نئے نقوش ثبت کر دینا محض ایک جنبش قلم سے ممکن نہیں ہے۔ ہمارا پرانا نظام تعلیم زندگی اور اس کے عملی مسائل سے ایک مدت دراز تک بے تعلق رہنے کے باعث

اس قدر بے جان ہو چکا ہے کہ اس سے فارغ التحصیل لوگوں میں ایک فی ہزار کے اوسط سے بھی ایسے آدمی نہیں نکل سکتے تھے جو ایک جدید ترقی یافتہ ریاست کے جج اور مجسٹریٹ بنائے جا سکیں۔ دوسری طرف موجودہ نظام تعلیم نے جو آدمی تیار کئے ہیں وہ اسلام اور اس کے قوانین سے بالکل بے بہرہ ہیں اور ان میں ایسے افراد بھی خال خال ہی پائے جاتے ہیں جن کی ذہنیت ہی کم از کم اس تعلیم کے زہریلے اثرات سے محفوظ رہ گئی ہو۔ پھر سو ڈیڑھ سو برس تک معطل رہنے کی وجہ سے ہمارا قانونی ذخیرہ بھی زمانے کی رفتار سے اچھا خاصا پیچھے رہ گیا ہے اور اسے موجودہ دَور کی عدالتی ضروریات کے لئے کارآمد بنانا کافی محنت چاہتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایک طویل مدت تک اسلامی اثر سے آزاد اور انگریزی حکومت کے تابع رہتے رہتے ہمارے اخلاق، تمدن، معاشرت، معیشت اور سیاست کا نقشہ اصل اسلامی نقشے سے بہت مختلف ہو چکا ہے۔ اس حالت میں ملک کے قانونی نظام کو ایک لخت بدل دینا — اگر ایسا کرنا ممکن بھی ہو — نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا کیونکہ اس صورت میں زندگی کا نظام اور قانونی نظام دونوں ایک دوسرے سے بیگانہ، بلکہ باہم متصادم ہوں گے اور ایسے قانونی تغیّر کا وہی حشر ہوگا جو ایک پودے کو ایسی آب وہوا اور ایسی زمین میں لگا دینے سے ہوا کرتا ہے جو اس کے مزاج سے کوئی مناسبت نہ رکھتی ہو۔ لہٰذا یہ بالکل ناگزیر ہے کہ جس اصلاح و تغیر کے ہم طالب ہیں وہ تدریج کے ساتھ ہو اور قانونی تبدیلیاں، اخلاق، تعلیم، معاشرت، تمدن، معیشت اور سیاست کی تبدیلیوں کے ساتھ متوازن طریقے سے کئے جائیں۔

ایک غلط بہانہ

لیکن تدریج کے اس معقول اور بجائے خود بالکل صحیح اصول کو بہانہ بنا کر جو لوگ اس بات کے حق میں استدلال کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سردست تو یہاں

ایک غیر دینی — بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں ایک بے دین — ریاست ہی قائم ہونی چاہئے پھر جب اسلامی ماحول تیار ہو جائے گا تو وہ اسلامی ریاست بھی قائم ہو جائے گی جو اسلامی قانون جاری کر سکے، وہ سراسر ایک نامعقول بات کہتے ہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ یہ ماحول تیار کون کرے گا؟ کیا ایک بے دین ریاست جس کی باگیں فرنگیت زدہ حکام اور لیڈروں کے ہاتھ میں ہوں؟ کیا وہ معمار جو صرف مے خانہ جم ہی کی تعمیر جانتے اور اسی سے دلچسپی بھی رکھتے ہیں ایک مسجد تعمیر کرنے کا سامان کریں گے ؟ اگر ان لوگوں کا یہی مطلب ہے تو انسانی تاریخ میں یہ پہلا اور بالکل نرالا تجربہ ہو گا کہ بے دینی خود دین کو پروان چڑھا کر اپنی جگہ لینے کے لئے تیار کرے گی اور اگر ان کا مطلب کچھ اور ہے تو وہ ذرا اس کی صاف صاف توضیح فرمائیں کہ اسلامی ماحول کی تیاری کا کام کون کس طاقت اور کن ذرائع سے کرے گا اور اس دوران بے دین ریاست اپنے ذرائع اور اقتدار کو کس چیز کی تعمیر و ترقی میں صرف کرتی رہے گی؟

ابھی ابھی تدریج کا اصول ثابت کرنے کے لئے جو مثالیں میں نے پیش کی ہیں۔ انہیں اگر آپ ایک مرتبہ پھر اپنے ذہن میں تازہ کر لیں تو آپ یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اسلامی نظام زندگی کی تعمیر ہو یا غیر اسلامی نظام زندگی کی، اگرچہ وہ ہوتی تو بتدریج ہی ہے، لیکن تدریجاً اس کی تعمیر صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب کہ ایک معمار طاقت اپنے سامنے ایک مقصد اور ایک نقشہ رکھ کر مسلسل اس کے لئے کام کرے۔ صدر اول میں جو اسلامی انقلاب ہوا تھا اسی طرح تو ہوا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے برسوں اس کے لئے سعی کی۔ موزوں آدمی تیار کئے، تعلیم و تبلیغ کے ذریعے سے لوگوں کے خیالات بدلے، حکومت کے پورے نظم و نسق کو معاشرے کی اصلاح اور ایک نئے تمدن کی تخلیق کے لئے استعمال کیا اور اس طرح وہ ماحول بنا جس میں اسلامی قانون جاری ہو سکا۔ ماضی کے قریب میں انگریزوں نے ہندوستان کے نظام زندگی میں جو تغیرات کئے وہ بھی اسی

طرح ہوئے کہ زمام کار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو اس تغیر کے خواہشمند تھے اور اس کے لئے کام کرنا جانتے تھے انہوں نے ایک مقصد اور نقشے کو نگاہ میں رکھ کر پیہم اس تغیر کے لئے کوشش کی اور آخر کار یہاں کے پورے نظام زندگی کو اس سانچے میں ڈھال کر ہی چھوڑا جو ان کے اصول و قوانین سے مناسبت رکھتا تھا۔ پھر کیا اب ہماری پیش نظر تعمیر اس معمار طاقت کے بغیر ہو جائے گی یا ایسے معماروں کے ہاتھوں ہو سکے گی جو اس نقشے پر تعمیر کا کام نہ جانتے ہوں اور نہ چاہتے ہوں۔

صحیح ترتیب کار

میں سمجھتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ ہر معقول آدمی اس معاملے میں مجھ سے اتفاق کرے گا کہ جب یہ پاکستان اسلام کے نام سے اور اسلام کے لئے مانگا گیا ہے اور اسی بنا پر ہماری یہ مستقل ریاست قائم ہوئی ہے تو ہماری اس ریاست ہی کو وہ معمار طاقت بننا چاہیئے جو اسلامی زندگی کی تعمیر کرے اور جب کہ یہ ریاست ہماری اپنی ریاست ہے اور ہم اپنے تمام قومی ذرائع و وسائل اس کے سپرد کر رہے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس تعمیر کے لئے کہیں اور سے معمار فراہم کریں۔

یہ بات اگر صحیح ہے تو پھر اس تعمیر کی راہ میں پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اپنی اس ریاست کو جو ابھی تک انگریز کی چھوڑی ہوئی کافرانہ بنیادوں پر قائم ہے، مسلمان بنائیں اور اسے مسلمان بنانے کی آئینی صورت یہ ہے کہ ہماری دستور ساز اسمبلی باقاعدہ اس بات کا اعلان کرے کہ:

(۱) پاکستان میں حاکمیت خدا کی ہے اور ریاست اس کے نائب کی حیثیت سے ملک کا انتظام کرے گی۔

(۲) ریاست کا اساسی قانون شریعت خداوندی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کے ذریعہ سے ہمیں پہنچی ہے۔

(۳) تمام پچھلے قوانین جو شریعت سے متصادم ہوتے ہیں بتدریج بدل دیئے جائیں گے اور آئندہ کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جاسکے گا جو شریعت سے متصادم ہوتا ہو۔

(۴) ریاست اپنے اختیارات کے استعمال میں اسلامی حدود سے تجاوز کرنیکی مجاز نہ ہوگی۔

یہ وہ کلمۂ شہادت ہے جسے اپنی آئینی زبان ـــ یعنی دستور ساز اسمبلی کے ذریعے سے ادا کرکے ہماری ریاست "مسلمان" ہو جائے گی۔ اس اعلان کے بعد ہی صحیح طور پر ہمارے رائے دہندگان کو یہ معلوم ہوگا کہ اب انہیں کس مقصد اور کس کام کے لئے اپنے نمائندے منتخب کرنے ہیں، عوام میں علم ودانش کی لاکھ کمی سہی مگر وہ اتنی سمجھ بوجھ ضرور رکھتے ہیں کہ انہیں کس کام کے لئے کس کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اور ان کے درمیان کون لوگ کس مطلب کے لئے موزوں ہیں۔ آخر وہ اتنے نادان تو نہیں ہیں کہ علاج کے لئے وکیل اور مقدمہ لڑنے کے لئے ڈاکٹر کو تلاش کریں۔ وہ اس کو بھی کسی نہ کسی حد تک جانتے ہی ہیں کہ ان بستیوں میں ایماندار اور خدا ترس لوگ کون ہیں، چالاک اور دنیا پرست کون، اور شریر و مفسد کون جیسا مقصد ان کے سامنے ہوتا ہے ویسے ہی آدمی وہ اس کے لئے اپنے اندر ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ اب تک ان کے سامنے یہ مقصد آیا ہی نہ تھا کہ انہیں ایک دینی نظام چلانے کے لئے آدمی درکار ہیں۔ پھر وہ اس کے چلانے والے آخر تلاش کرتے کیوں۔ جیسا بے دین اور غیر اخلاقی نظام ملک میں قائم تھا اور اس کا مزاج جس قسم کے آدمی چاہتا تھا اس کے لئے ویسے ہی آدمیوں پر لوگوں کی نگاہ انتخاب پڑی اور ان ہی کو رائے دہندوں نے چن کر بھیجدیا۔ اب اگر ہم ایک اسلامی ریاست کا دستور بنائیں اور لوگوں کے سامنے سوال یہ آجائے کہ اس نظام کو چلانے کے لئے انہیں موزوں آدمی منتخب کرنے ہیں تو چاہے ان کا انتخاب کمال درجے کا معیاری نہ ہو مگر بہر حال اس

کام کے لئے ان کی نگاہیں فساق و فجار اور دین مغربی کے مومنین پر نہیں پڑیں گی۔ وہ اس کے لئے ان ہی لوگوں کو تلاش کریں گے جو اخلاقی، ذہنی اور علمی حیثیت سے اس کے اہل ہوں گے۔

پس ریاست کو مسلمان بنانے کے بعد تعمیر حیات اسلامی کی راہ میں دوسرا قدم یہ ہے کہ جمہوری انتخاب کے ذریعہ سے اس ریاست کی زمام کار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہو جو اسلام کو جانتے بھی ہوں اور اس کے مطابق ملک کے نظام زندگی کو ڈھالنا چاہتے بھی ہوں۔

اس کے بعد تیسرا قدم یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ہمہ گیر اصلاح کا ایک منصوبہ (PLAN) بنایا جائے اور اسے عمل میں لانے کے لئے ریاست کے تمام ذرائع و وسائل استعمال کئے جائیں۔ تعلیم کا نظام بدلا جائے۔ ریڈیو، پریس، سنیما اور خط و کتابت کی ساری طاقتیں لوگوں کے خیالات کی اصلاح اور ایک نئی اسلامی ذہنیت کی تخلیق میں صرف کی جائیں۔ معاشرت اور تمدن کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کے لئے پیہم اور باقاعدہ کوشش کی جائے۔ سول سروس، پولیس، جیل، عدالت اور فوج سے بتدریج ان عناصر کو خارج کیا جائے جو پرانے فاسقانہ و کافرانہ نظام کی عادات و خصائل میں ڈھل کر سوکھ چکے ہیں اور ان عناصر کو کام کرنے کا موقع دیا جائے جو اس اصلاح کے کام میں مددگار بن سکتے ہیں۔ معاشی نظام میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں اور اس کا پورا ڈھانچہ جو پرانی ہندوانہ اور جدید فرنگیانہ بنیادوں پر چل رہا ہے، ادھیڑ ڈالا جائے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر ایک صالح اور مدبّر گروہ اقتدار کے منصب پر فائز ہو اور ملک کے سارے وسائل اور حکومت کے پورے نظم و نسق کی طاقت سے کام لے کر باقاعدگی کے ساتھ اصلاح کے ایک سوچے سمجھے منصوبے پر عمل شروع

کر دے تو دس سال کے اندر اس ملک کی اجتماعی زندگی کا نقشہ بالکل بدل ڈالا جا سکتا ہے اور جیسے جیسے یہ تبدیلی واقع ہوتی جائے ایک صحیح توازن کے ساتھ سابق قوانین کی ترمیم و تنسیخ اور اسلامی قوانین کے نفاذ کا سلسلہ جاری ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ بالآخر جاہلیت کا کوئی قانون ہمارے ملک میں نہ رہے اور اسلام کا کوئی حکم نافذ ہونے سے نہ رہ جائے۔

اجرارِ قانونِ اسلامی کیلئے تعمیری کام

اب میں خاص طور پر اس تعمیری کام کی کچھ تفصیل آپ سے بیان کروں گا جو ملک کے قانونی نظام کو بدلنے اور اسلام کے قوانین کو جاری کرنے کے لئے ہمیں کرنا ہو گا۔ جس اصلاحی پروگرام کی طرف ابھی میں اشارہ کر چکا ہوں اس کے سلسلہ میں ہم کو قریب قریب ہر شعبۂ زندگی میں بہت سے تعمیری کام کرنے پڑیں گے، کیونکہ مدت ہائے دراز کے تعطّل انحطاط اور غلامی نے ہمارے تمدّن کی عمارت کے ہر گوشے کو خراب کر کے چھوڑا ہے لیکن اس وقت میری تقریر ایک خاص موضوع سے تعلق رکھتی ہے اس لئے دوسرے گوشوں کے تعمیری کام سے قطع نظر کر کے یہاں میں صرف اس کام کے متعلق کچھ عرض کروں گا جو ہمیں قانون اور نظم عدالت کے سلسلہ میں کرنا ہے۔

ایک قانونی اکیڈیمی کا قیام

اس پہلو میں اولیں کام جو ہمیں کرنا چاہیئے یہ ہے کہ ایک قانونی اکیڈیمی قائم کی جائے جو اس پورے کام کا جائزہ لے جو علم قانون میں ہمارے اسلاف اس سے پہلے کر چکے ہیں اور ان ضروری کتابوں کو جو ہمارے فقہ اسلامی کی واقفیت کے لئے ناگزیر ہیں۔ اردو زبان میں صرف منتقل ہی نہ کرے بلکہ ان کے مواد کو زمانۂ حال کے طرز ترتیب کے مطابق مرتب بھی کر دے تاکہ ان سے پورا فائدہ اٹھایا جا سکے۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، ہماری فقہ کا اصل ذخیرہ عربی زبان میں ہے اور ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ بالعموم اس زبان سے ناواقف ہے۔ اس ناواقفیت کی وجہ سے اور کچھ سنی سنائی باتوں کی بنا پر، ہمارے پڑھے لکھے لوگ عموماً اس فقہی ذخیرے کے متعلق طرح طرح کی بد گمانیاں رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں سے بہت سے لوگ تو یہاں تک کہہ بیٹھتے ہیں کہ دور از کار لا طائل اختلافی بحثوں کے اس دفتر بے معنی کو دریا برد کر دیا جائے اور نئے سرے سے اجتہاد کر کے کام چلایا جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کے مہمل خیالات ظاہر کرتے ہیں۔ اگر وہ اپنے بزرگوں کے فقہی کارناموں کا واقعی مطالعہ کریں تو مجھے یقین ہے کہ انہیں اپنی ان باتوں پر خود ہی شرم آنے لگے گی۔ انہیں معلوم ہوگا کہ پچھلی بارہ تیرہ صدیوں میں ہمارے اسلاف محض فضول بحثوں میں وقت ضائع نہیں کرتے رہے ہیں بلکہ انہوں نے اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لئے بڑی قیمتی میراث چھوڑی ہے وہ بہت ہی ابتدائی منزلیں ہمارے لئے تعمیر کر گئے ہیں اور ہم سے بڑھ کر زیاں کار کوئی نہ ہوگا۔ اگر ہم محض جہالت کی بنا پر اس بنی ہوئی عمارت کو خواہ مخواہ ڈھا کر نئے سرے سے ہی تعمیر کی ابتدا کرنے پر اصرار کریں۔ ہمارے لئے عقلمندی یہی ہے کہ جو اگلے بنا گئے ہیں اسے اپنی آج کی ضرورتوں کے لئے کارآمد بنائیں اور آگے جن چیزوں کی ضرورت پیش آئے اس کے لئے مزید تعمیر کرتے رہیں۔ ورنہ ہر نسل اگر یوں ہی اپنے سے پہلی نسلوں کے کام پر پانی پھیرتی رہے اور نئے سرے سے سب کچھ بنانے کی کوشش کرے تو یقیناً ترقی کی طرف قدم آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔

میں اس سلسلہ کی پہلی تقریر میں عرض کر چکا ہوں کہ پچھلی صدیوں میں دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر مسلمانوں کی جس قدر سلطنتیں قائم ہوئی تھیں ان سب کا قانون فقہ اسلامی ہی تھا۔ اس زمانے میں مسلمان نری گھاس نہیں کھودتے تھے بلکہ ایک اعلیٰ درجہ کا تمدن ان کے اندر موجود تھا۔ ان کے وسیع تمدن کی ساری

ہی ضروریات پر ان کے فقہاء نے اسلامی قوانین کو منطبق کیا تھا۔ یہی فقہا ان حکومتوں کے جج مجسٹریٹ اور چیف جسٹس ہوتے تھے اور ان کے فیصلوں سے نظائر کا ایک وسیع ذخیرہ فراہم ہو گیا تھا۔ انہوں نے قریب قریب ہر شعبۂ قانون سے بحث کی ہے۔ محض دیوانی اور فوجداری قوانین ہی نہیں، دستوری اور بین الاقوامی قوانین کے متعلق بھی ان کے قلم سے ایسی ایسی لطیف بحثیں نکلی ہیں کہ ان کا مطالعہ کر کے ایک قانون داں آدمی ان کی ژرف نگاہی کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ضرورت ہے کہ ہم اہل علم کے ایک گروہ کو ان بزرگوں کے چھوڑے ہوئے ذخیرہ کا جائزہ لینے پر مامور کریں اور وہ موجودہ زمانے کی قانونی کتابوں کے طرز پر اس تمام کار آمد مواد کو مرتب کر ڈالے جو اس ذخیرے میں مل سکتا ہو۔

خصوصیت کے ساتھ چند کتابیں تو ایسی ہیں کہ جن کو اُردو زبان میں منتقل کر لینا نہایت ضروری ہے۔

(۱) احکام القرآن پر تین کتابیں۔ جصّاص، ابن العربی اور قرطبی۔ ان کتابوں کا مطالعہ ہمارے قانونی طلباء کو قرآن مجید سے احکام مستنبط کرنے کی بہترین تربیت دے گا۔ ان میں قرآن کی تمام احکامی آیات کی تفسیر کی گئی ہے، احادیث اور آثارِ صحابہ میں ان کی جو تشریح ملتی ہے اسے نقل کیا گیا ہے اور مختلف ائمہ مجتہدین نے ان سے جو احکام نکالے ہیں ان کے دلائل سمیت مفصل بیان کر دیا گیا ہے۔

(۲) دوسرا قیمتی ذخیرہ کتب حدیث کی شرحوں کا ہے جن میں احکام کے علاوہ نظائر اور تشریحی بیان کا بھی بہترین مواد ملتا ہے۔ ان میں خاص طور پر یہ کتابیں اردو زبان میں منتقل ہونی چاہئیں۔

بخاری پر : فتح الباری اور عینی
مسلم پر : نووی اور مولانا شبیر احمد صاحب

عثمانی فتح الملہم

ابوداؤد پر : عون المعبود اور بذل المجہود

موطّا پر : شاہ ولی اللہ صاحب مسوّی اور مصفیٰ اور موجودہ دور کے ایک ہندوستانی عالم کی اوجز المسالک

منتقی الاخبار پر : شوکانی کی نیل الاوطار

مشکوٰۃ پر : مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی التعلیق الصبیح

علم الآثار میں : امام طحاوی کی شرح معانی الآثار

(۳۳) اس کے بعد ہمیں فقہ کی بڑی بڑی کتابوں کو لینا چاہیئے جو اس علم میں امہات کتب کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ یہ کتابیں اُردو میں منتقل ہونا چاہیئیں۔

فقہ حنفی پر : امام سرخسی کی المبسوط اور شرح السیر الکبیر کاشانی کی بدائع الصنائع۔ ابن ہمام کی فتح القدیر مع ہدایہ اور فتاویٰ عالمگیری

فقہ شافعی پر : کتاب الام۔ شرح المہذب اور مغنی المحتاج۔

فقہ مالکی پر : المدوّنہ اور کوئی اہم کتاب جس کو اہل علم انتخاب کریں۔

فقہ حنبلی پر : ابن قدامہ کی المغنی

فقہ ظاہری پر : ابن حزم کی المحلی

مذاہب اربعہ پر : ابن رشد کی بدایۃ المجتہد اور علماء مصر کی مرتب کردہ الفقہ فی المذاہب الاربعہ

مخصوص مسائل پر : امام ابو یوسف کی کتاب الخراج، یحییٰ بن آدم کی الخراج، ابو عبید القاسم کی کتاب الاموال۔ ہلال بن یحییٰ کی احکام الوقف ومیاطی کی احکام المواریث

(۴) پھر ہمیں اصول قانون اور حکمت تشریع کی بھی چند اہم کتابوں کو اُردو کا جامہ پہنا لینا چاہیئے تاکہ ان کی مدد سے ہمارے اہل قانون میں اسلامی فقہ کا صحیح فہم اور اس کی روح سے گہری واقفیت پیدا ہو۔ میرے خیال میں اس موضوع پر یہ کتابیں قابل انتخاب ہیں۔

ابن حزم کی اصول الاحکام، علامہ آمدی کی الاحکام، الاصول الاحکام خضری کی اصول الفقہ۔ امام شاطبی کی الموافقات، ابن القیم کی اعلام الموقعین اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ۔

ان کتابوں کے متعلق ہمیں صرف اتنا ہی نہیں کرنا ہے کہ محض ان کے ترجمہ اُردو زبان میں کر ڈالے جائیں بلکہ ان کے مضامین کو موجودہ زمانے کی قانونی کتابوں کے طرز پر از سر نو مرتب بھی کرنا ہوگا۔ نئے عنوانات قائم کرنے ہوں گے۔ منتشر مسائل کو ایک ایک عنوان کے تحت جمع کرنا ہوگا فہرستیں بنانی پڑیں گی اور انڈکس تیار کرنے ہوں گے۔ اس محنت کے بغیر یہ کتابیں آج کل کی ضروریات کے لئے پوری طرح کارآمد نہ ہو سکیں گی۔ قدیم زمانہ کا طریق تدوین کچھ اور تھا۔ اور اس زمانے میں قانونی مسائل کے لئے اتنے مختلف عنوانات بھی پیدا نہیں ہوئے تھے جتنے آج پیدا ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ دستوری قانون اور بین الاقوامی قانون کے لئے

کوئی الگ نام نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کے مسائل کو وہ نکاح، خراج، جہاد اور میراث کے ابواب میں بیان کرتے تھے۔ فوجداری قانون ان کے ہاں کوئی الگ عنوان نہ تھا، بلکہ اس کے مسائل حدود، جنایات اور دیات کے مختلف عنوانوں میں تقسیم کر دیئے جاتے تھے۔ دیوانی قانون کو بھی انہوں نے الگ مرتب نہیں کیا تھا، بلکہ ایک ہی مجموعہ قوانین میں بہت سے عنوانات کے تحت اس کو جمع کر دیا تھا۔ مالیات اور معاشیات وغیرہ نام ان کے نہ تھے۔ اس سلسلہ کے مسائل کو وہ کتاب البیوع، کتاب الصرف، کتاب المضاربہ اور کتاب المزارعہ وغیرہ عنوانات کے تحت بیان کرتے تھے۔ اسی طرح قانون شہادت، ضابطہ دیوانی، ضابطہ فوجداری اور ضابطہ عدالت وغیرہ جدید اصطلاحیں ان کے ہاں نہیں بنی تھیں ان قوانین کے مسائل ان کی کتابوں میں آداب القاضی، کتاب الدعویٰ، کتاب الاکراہ، کتاب الشہادت اور کتاب الاقرار وغیرہ عنوانات کے تحت ملتے ہیں۔ اب اگر یہ کتابیں جوں کی توں اُردو میں منتقل کر لی جائیں تو ان سے کماحقہٗ فائدہ اٹھانا مشکل ہے۔ ضرورت ہے کہ کچھ قانونی نظر رکھنے والے اہل علم ان پر کام کریں اور ان کی ترتیب بدل کر ان کے مواد کو جدید طرز پر مرتب کر ڈالیں اور بالفرض اگر یہ بہت زیادہ محنت طلب کام نظر آئے تو کم از کم اتنا تو ضرور ہی ہونا چاہئے کہ ان کی فہرستیں پوری باریک بینی کے ساتھ بنائی جائیں اور ایسے مختلف قسم کے انڈکس بنا دیئے جائیں جن کے ذریعہ سے ان میں مسائل کا تلاش کرنا آسان ہو جائے۔

تدوین احکام

اس سلسلہ کا دوسرا اہم کام یہ ہے کہ ذمہ دار علماء اور ماہرین قانون کی ایک ایسی مجلس مقرر کی جائے جو اسلام کے قانونی احکام کو جدید دَور کی کتب قانون کے طرز پر دفعہ وار مدوّن (CODIFY) کر دے۔

میں اپنی پہلی تقریر میں وضاحت کے ساتھ یہ بات آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے قانون کا اطلاق ہر اس قول پر نہیں ہوتا جو کسی فقیہہ یا امام مجتہد کی زبان سے نکلا ہو یا کسی فقہی کتاب میں لکھا ہوا ہو۔ قانون صرف چار چیزوں کا نام ہے۔

(۱) کوئی حکم جو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے دیا ہو۔

(۲) کسی قرآنی حکم کی تشریح و تفصیل، یا کوئی مستقل حکم جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔

(۳) کوئی استنباط، قیاس، اجتہاد یا استحسان جس پر امت کا اجماع ہو یا جمہور علماء کا ایسا فتویٰ ہو جسے ہمارے ملک کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت تسلیم کرتی رہی ہے۔

(۴) اسی قبیل کا کوئی ایسا امر جس پر ہمارے ملک کے اہل حل و عقد کا اب اجماعی یا جمہوری فیصلہ ہو جائے۔

میری تجویز یہ ہے کہ پہلی تین قسموں کے احکام کو ماہرین کی ایک جماعت ایک مجلۂ احکام (CODE) کی شکل میں مرتب کر دے۔ پھر جو جو قوانین آئندہ اجماعی یا جمہوری فیصلوں سے بنتے جائیں ان کا اضافہ ہماری کتاب آئین میں کیا جاتا رہے اگر اس قسم کا ایک مجلۂ احکام بن جائے تو اصل قانون کی کتاب وہ ہو گی اور باقی تمام فقہی کتابیں اس کے لئے شرح (COMMENTARY) کی حیثیت میں ہوں گی۔ نیز اس طرح عدالتوں میں قانون اسلامی کی تنقید اور کالجوں میں اس قانون کی تعلیم بھی آسان ہو جائے گی۔

قانونی تعلیم کی اصلاح

تیسرا ضروری کام یہ ہے کہ ہم اپنے ہاں قانون کی تعلیم کا سابق طریقہ بدل

دیں اور اپنے لا کالجوں کے نصاب اور طریق تربیت میں ایسی اصلاحات کریں جن سے طلبہ اسلامی قانون کی تنقید کے لئے علمی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے تیار ہو سکیں۔

اس وقت تک جو تعلیم ہماری قانونی درس گاہوں میں دی جا رہی ہے وہ ہمارے نقطۂ نظر سے بالکل ناکارہ ہے۔ اس سے فارغ ہو کر نکلنے والے طالب علم صرف یہی نہیں کہ اسلامی قانون کے علم سے بے بہرہ ہوتے ہیں بلکہ ان کی ذہنیت بھی غیر اسلامی افکار کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے اور ان کے اندر اخلاقی صفات بھی ویسی ہی پیدا ہو جاتی ہیں جو مغربی قوانین کے اجراء کے لئے موزوں تو ہیں مگر اسلامی قانون کو نافذ کرنے کے لئے قطعاً غیر موزوں ہیں۔ اس صورت حال کو جب تک ہم بدل نہ دیں گے اور ان درس گاہوں میں اپنے معیار کے فقیہہ پیدا کرنے کا انتظام نہ کریں گے ہمارے ہاں وہ آدمی فراہم ہی نہ ہو سکیں گے جو ہماری عدالتوں میں قاضی اور مفتی کے فرائض انجام دینے کے لائق ہوں۔

اس مقصد کے لئے جو تجاویز میرے ذہن میں ہیں وہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ دوسرے اہل علم بھی ان پر غور کریں اور ان میں اصلاح و اضافہ فرمائیں تا کہ ایک اچھی قابلِ عمل اسکیم بن سکے۔

(۱) سب سے مقدم اصلاح یہ ہونی چاہئے کہ آئندہ سے لا کالجوں میں داخلے کے لئے عربی زبان کی واقفیت ـــ اتنی واقفیت جو قرآن ـــ حدیث و فقہ کا مطالعہ کرنے کے لئے کافی ہو ـــ لازم قرار دی جائے اگرچہ ہم اسلامی قانون کی پوری تعلیم اردو میں دینا چاہتے ہیں اور اس فن کی تمام ضروری کتابوں کو بھی اردو میں منتقل کر لینا چاہتے ہیں لیکن اس کے باوجود عربی زبان کے علم کی ضرورت پھر بھی باقی رہے گی۔ اس لئے کہ اسلامی فقہ میں بصیرت بہرحال اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک آدمی اس زبان سے واقف نہ ہو جس میں قرآن نازل ہوا ہے اور جس میں رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام فرمایا ہے۔ ابتداءً ہمیں لا کالجوں کے لئے عربی داں امیدوار فراہم کرنے میں دشواری ضرور پیش آئے گی۔ ممکن ہے اس غرض کے لئے ہم کو چند سال تک ہر لا کالج میں ایک مستقل کلاس عربی تعلیم کے لئے کھولنی پڑے اور شاید تعلیم قانون کی مدت میں ایک سال کا اضافہ بھی کر دینا پڑے لیکن آگے چل کر جب ہمارے پورے نظام تعلیم میں عربی بطور ایک لازمی زبان کے شامل ہو جائے گی تو لا کالج میں داخلہ کے لئے جو گریجویٹ بھی آئیں گے وہ پہلے ہی عربی زبان سے بخوبی واقف ہوں گے۔

(۲) عربی زبان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قانون کی تعلیم شروع کرنے سے پہلے طلبہ کو قرآن اور حدیث کے براہ راست مطالعہ سے دین کا مزاج اور اس کا پورا نظام اچھی طرح سمجھا دیا جائے ہماری عربی درس گاہوں میں بھی ایک مدت دراز سے یہ غلط طریقہ چلا آ رہا ہے کہ تعلیم کی ابتدار فقہ سے کی جاتی ہے۔ پھر ہر مذہب (اسکول)، کے لوگ اپنے مخصوص فقہی نقطۂ نظر سے حدیث پڑھاتے ہیں اور قرآن کی صرف ایک یا دو بڑی سورتیں محض تبرکاً داخل درس کر دی جاتی ہیں۔ بلکہ ان میں بھی کلام الٰہی کی ادبی خوبیوں کے سوا کسی اور چیز کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ جو فضلا، ان درس گاہوں سے نکلتے ہیں وہ قانون کے جزئیات و فروع سے تو خوب واقف ہوتے ہیں مگر جس دین کو قائم کرنے کے لئے یہ قانون بنایا گیا ہے اس کے مجموعی نظام، اس کے مقاصد، اس کے مزاج اور اس کی روح سے بڑی حد تک نابلد رہتے ہیں۔ ان کو یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ دین سے شریعت کا اور شریعت سے فقہی مذاہب کا تعلق کیا ہے۔ وہ قانونی جزئیات اور اپنے مذہب خاص کے فروعی مسائل ہی کو اصل دین سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اسی چیز نے ہمارے ہاں فرقہ بندی کے جھگڑے تعصبات پیدا کئے ہیں اور اسی چیز کا نتیجہ یہ ہے کہ مسائل زندگی پر فقہی احکام کا انطباق کرنے میں بارہا شریعت کے اہم ترین مقاصد تک نظر انداز کر دئے جاتے ہیں۔ ہم چاہتے

ہیں کہ اب اس غلطی کی اصلاح ہو اور کسی طالب علم کو اس وقت تک قانون نہ پڑھایا جائے جب تک وہ پہلے قرآن اور پھر حدیث سے دین کو اچھی طرح نہ سمجھ لے۔

اس معاملے میں بھی ہمیں ابتداءً چند سال تک کچھ مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔ کیونکہ قرآن و حدیث سے واقف گریجویٹ نہ مل سکیں گے اور اس کے لئے شاید ہمیں لا کالجوں ہی میں اس تعلیم کا بھی انتظام کرنا پڑے گا لیکن آگے چل کر جب ہماری عام تعلیمی اصلاحات بار آور ہو جائیں گی تو آسانی کے ساتھ یہ ضابطہ بنایا جا سکے گا کہ لا کالجوں میں صرف وہی طلبہ داخلہ لے سکتے ہیں جو تفسیر و حدیث کو مخصوص مضامین کی حیثیت سے لے کر بی۔ اے کر چکے ہوں، ورنہ دوسرے مضامین کی طلبہ کو ایک سال زائد ان مضامین پر صرف کرنا ہوگا۔

(۳) تعلیم قانون کے نصاب میں تین مضامین ضرور شامل ہونے چاہئیں۔ ایک جدید زمانے کے اصول قانون (JURIS PRUDENCE) کے ساتھ ساتھ اصول فقہ کا مطالعہ، دوسرے اسلامی فقہ کی تاریخ کا مطالعہ، تیسرے فقہ کے تمام بڑے بڑے مذاہب (اسکولوں) کا غیر متعصبانہ مطالعہ۔ ان تینوں چیزوں کے بغیر طلبہ میں نہ تو فقہ کا پورا فہم پیدا ہو سکتا ہے۔ نہ ان کے اندر وہ اجتہادی صلاحیتیں ابھر سکتی ہیں جو اعلیٰ درجہ کے قاضی اور مفتی بننے کے لئے ناگزیر ہیں اور نہ ان کے اندر سے ایسے ماہرین نکل سکتے ہیں جو ہماری ترقی پذیر ریاست کی روز افزوں ضروریات کے لئے تعبیر و قیاس اور اجتہاد و استحسان کے صحیح طریقے استعمال کر کے قوانین بنا سکیں۔ اپنے قانون کے اصولوں کو پوری طرح سمجھے بغیر آخر وہ روز نت نئے پیش آنے والے مسائل پر ان کا انطباق کیسے کر سکیں گے۔ اپنی فقہ کی تاریخ کو جانے بغیر انہیں کیوں کر معلوم ہوگا کہ اسلامی قانون کا ارتقاء کس طریقے پر ہوا ہے اور آئندہ کس طریقہ پر ہو سکتا ہے فقہائے اسلام کے جمع کئے ہوئے پورے ذخیرے پر وسیع نظر رکھے بغیر وہ کیوں کر اس قابل ہو سکیں گے کہ جب کسی مسئلے میں ایک فقہی مذہب سے رہنمائی نہ ملتی ہو تو نیا اجتہاد کرنے سے پہلے دوسرے مذاہب فقہ سے استفادہ کرلیں۔ ان ہی وجوہ سے میں ضروری

سمجھتا ہوں کہ ہماری تعلیم قانون کے نصاب میں یہ تینوں مضامین داخل ہوں۔

(۴) تعلیم کی اس اصلاح کے ساتھ ہمیں اپنے لا کالجوں میں طلباء کی اخلاقی تربیت کا بھی خاص انتظام کرنا ہوگا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے لا کالج چالاک وکیل، نفس پرست مجسٹریٹ اور بدکردار جج تیار کرنے کی فیکٹری نہیں ہے بلکہ اس کا کام تو ایسے قاضی اور مفتی پیدا کرنا ہے جو اپنی قوم میں اپنی سیرت و کردار کے لحاظ سے بلند ترین لوگ ہوں جن کی راستبازی اور عدل و انصاف پر کامل اعتماد کیا جاسکے جن کی اخلاقی ساکھ ہر شبہ سے بالاتر ہو۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سب سے بڑھ کر خدا ترسی، پرہیزگاری اور احساسِ ذمہ داری کا دور دورہ ہونا چاہئے۔ یہاں سے نکلنے والے طلبہ کو اس مسند کے لئے تیار ہونا ہے جس پر کبھی قاضی شریح و امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام احمد ابن حنبل اور قاضی ابو یوسف جیسے لوگ بیٹھ چکے ہیں۔ یہاں ایسے مضبوط کیرکٹر کے آدمی تیار ہونے چاہئیں جو کسی مسئلہ شرعی میں فتویٰ دیتے وقت یا کسی معاملہ کا فیصلہ کرتے وقت خدا کے سوا کسی کی طرف نظر نہ رکھیں، کوئی لالچ، کوئی خوف، کوئی ذاتی دلچسپی، کوئی محبت اور کوئی نفرت ان کو اس بات سے نہ ہٹا سکے جسے وہ اپنے علم اور اپنے ضمیر کے لحاظ سے حق اور انصاف کی بات سمجھتے ہوں۔

عدالتی نظام کی اصلاح

اسلامی قانون کے اجراء کی خاطر زمین ہموار کرنے کے لئے ہمیں عدالتی نظام میں بھی بہت کچھ تبدیلیاں کرنی ہوں گی۔ اس سلسلہ میں چھوٹی چھوٹی تفصیلات کو چھوڑ کر میں دو چیزوں کا خاص طور پر ذکر کروں گا جو اسلامی نقطۂ نظر سے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

پیشۂ وکالت کا انسداد

اول اصلاح طلب معاملہ پیشۂ وکالت کا ہے جو موجودہ عدالتی نظام کی

بدترین خرابیوں میں سے ایک بلکہ شاید سب سے بدتر چیز ہے۔ اخلاقی اعتبار سے اس کے جواز میں ایک حرف نہیں کہا جا سکتا۔ عملی حیثیت سے عدالتی کام کی کوئی حقیقی ضرورت ایسی نہیں ہے جو اس کے بجائے کسی دوسرے مناسب طریقہ سے پوری نہ کی جا سکتی ہو۔ اور اسلام کے مزاج سے یہ پیشۂ قانون بازی اس قدر بُعد رکھتا ہے کہ جب تک یہ پیشہ جاری ہے ہماری عدالتوں میں اسلامی قانون اپنی صحیح اسپرٹ کیساتھ جاری ہی نہیں ہو سکتا بلکہ اگر کہیں خدائی قانون کیساتھ یہاں وہ بازیگری کی گئی جو انسانی قانون کے ساتھ روز کی جا رہی ہے۔ تو عجب نہیں کہ ہم انصاف کیساتھ ایمان بھی کھو بیٹھیں۔ لہٰذا یہ نہایت ضروری ہے کہ اس پیشہ کو بتدریج ختم کر دیا جائے۔

نظری حیثیت سے وکیل کا کام یہ ہے کہ وہ عدالت کو قانون سمجھنے اور مقدمہ زیر سماعت کے حالات پر اسے منطبق کرنے میں مدد دے، اصولاً یہ ضرورت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ ایک مقدمہ میں دو ماہرین قانون کی رائیں مختلف ہو سکتی ہیں، ہو سکتا ہے کہ ایک کی رائے میں ایک فریق کا مقدمہ مضبوط ہو تو دوسرے کی رائے میں دوسرے فریق کا اور عدالت کے لئے صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں دونوں طرف کے دلائل سے مطلع ہونا یقیناً مفید ہوتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کی جو صورت طریقۂ وکالت کی شکل میں اختیار کی گئی ہے کیا فی الواقع اس سے یہ دونوں فائدے حاصل ہوتے ہیں؟ ایک وکیل اپنی قانونی مہارت کو لے کر بازار میں بیٹھ جاتا ہے اور تیار رہتا ہے کہ جس مقدمہ کا جو فریق بھی اس کے دماغ کا کرایہ ادا کرنے کے لئے تیار ہو اس کے حق میں وہ قانونی نکات سوچنا شروع کر دے اس کو اس سے کوئی بحث نہیں ہوتی کہ میرا موکل حق پر ہے یا باطل پر، مجرم ہے یا بے گناہ، اپنا حق لینا چاہتا ہے یا دوسرے کا حق مار کھانا چاہتا ہے۔ اس کو اس سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ قانون کا منشاء درحقیقت کیا ہے اور اس کی رو سے اس کے موکل کا مقدمہ صحیح ہے یا غلط۔ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ اس شخص نے مجھے فیس دی ہے اور میرا کام اس کی حمایت کرنا ہے اس لئے وہ مقدمہ کو چھیل بنا کر قانون کے مطابق ڈھالتا ہے کمزور پہلوؤں کو چھپاتا ہے، موافق پہلوؤں کو ابھارتا ہے، روداد

مقدمہ اور شہادتوں میں سے چن چن کر صرف وہ چیزیں نکالتا ہے جو اس کے موکل کی تائید میں ہوں گواہوں کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ مقدمہ کے صحیح واقعات، اگر وہ اس کے موکل کیخلاف پڑتے ہوں۔ روشنی میں نہ آسکیں یا کم از کم مشتبہ ہو جائیں اور قانون کی صرف مفید مطلب تعبیریں پیش کر کے اور ان کے حق میں دلائل دے کر جج کو گمراہ کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کے قلم سے وہ فیصلہ نکلے جو اس کے موکل کے موافق ہو نہ کہ وہ جو تقاضائے انصاف ہو۔ اب خواہ کوئی حقیقی مجرم چھوٹ جائے یا کوئی واقعی بے گناہ پھنس جائے، کوئی حق دار بے حق ہو جائے یا غیر مستحق دوسرے کا حق مار کھا جائے، وکیل اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ وہ حق کی حمایت کرنے اور انصاف کرانے کے لئے وکالت خانے میں نہیں بیٹھتا۔ اس کا مقصد ہوتا ہے روپیہ۔ جو اسے روپیہ دے، وہی حق پر ہے۔ خواہ وہ مقدمہ کا ایک فریق ہو یا دوسرا فریق۔ میں پوچھتا ہوں، کیا کسی اصول اخلاق کے لحاظ سے یہ پیشہ ورانہ قانون بازی جائز ٹھیرائی جا سکتی ہے؟ کیا کوئی صاحبِ ضمیر، خدا ترس اور ایماندار آدمی محض فیس کی خاطر اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر لے سکتا ہے کہ مظلوم کو داد سے محروم کرانے اور ظالم کو ظلم برقرار رکھنے کی کوشش کرے؟ اور کیا فی الواقع ایسے ماہرین قانون کا مشورہ ججوں کو انصاف کے کام میں کچھ بھی مدد دے سکتا ہے جو علانیہ اس مقصد کے لئے فیس لئے بیٹھے ہوں کہ قانون کی تعبیر لازماً اپنے موکل ہی کے حق میں کریں گے؟ کیا کسی قانونی مسئلہ میں ایک مقدمہ کے دو مخالف وکیلوں کا اختلافِ رائے حقیقی ایماندارانہ اختلاف رائے ہوتا ہے، درآں حالیکہ یہی دونوں وکیل اتنے ہی زور کیساتھ بالکل برعکس رائیں پیش کرتے اگر دونوں کے موکل بدلے ہوئے ہوتے؟

حقیقت یہ ہے کہ اس پیشۂ وکالت نے صرف ہمارے نظام عدل و انصاف ہی کو سخت نقصان نہیں پہنچایا ہے اور صرف اتنا ہی نہیں کیا ہے کہ ہماری سوسائٹی میں قانون کی پیروی کے بجائے اس کی خلاف ورزی کو وسعت و طاقت بخشی ہو۔ بلکہ اس کا نقصان ہماری پوری اجتماعی زندگی میں پھیل گیا ہے اور ہماری سیاست بھی اسی کی وجہ سے گندی ہو کر رہ گئی ہے

زبان اور ضمیر کا تعلق منقطع کرنے کی مشق آپ کے کالجوں کی مجالس مباحثہ سے شروع ہوتی ہے یہاں ایک بولنے والے کی اصل خوبی یہی سمجھی جاتی ہے کہ وہ مسئلہ زیر بحث کے دونوں پہلوؤں کی حمایت میں یکساں زور کے ساتھ بول سکے۔ اور جس جانب سے بھی کھڑا ہو جائے دلائل کے انبار لگا دے، خواہ اس کی ذاتی رائے اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ابتدائی مشق پیشہ وکالت میں داخل ہو کر خوب منجھتی اور پختہ ہوتی ہے۔ پھر جب ایک وکیل سالہا سال تک دل کے خلاف دماغ لڑانے اور ضمیر کے خلاف زبان چلانے میں ماہر کامل ہو چکتا ہے، تب وہ اپنی اسی سیرت کو لئے ہوئے ہماری قومی زندگی (PUBLIC LIFE) میں داخل ہوتا ہے اور اپنے اس اخلاقی زہر کو ہمارے علمی اور تمدنی اور سیاسی اداروں میں ہر طرف پھیلا دیتا ہے اسلام اس پیشہ کو کسی طرح برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس کے نظام میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یہ اسکے مزاج اور اس کی روح اور اس کی روایات کے بالکل خلاف ہے۔ پچھلی دس بارہ صدیوں میں آدھی سے زیادہ دنیا پر مسلمانوں نے حکومت کی ہے اور کہیں ان کے نظام عدالت میں اس قانونی پیشہ کا نشان ہمیں نہیں ملتا۔ اس کے بجائے ہمارے ہاں مفتی کا منصب تھا۔ اور اب ہمیں اسی کو تازہ کرنا چاہئے۔ قدیم زمانے میں مفتی زیادہ تر اپنی روزی کسی آزاد کاروبار سے کماتے تھے اور لوگوں کو فتوے بلا معاوضہ دیا کرتے تھے۔ آج کی بڑھی ہوئی ضروریات کے لئے ہم ایسا کر سکتے ہیں کہ ہر شہر اور ہر ضلع اور ہر تحصیل کی ضرورتوں کے مطابق ایک کافی تعداد میں ماہرین قانون جن میں مخصوص شعبہائے قانون کے اختصاصی ماہرین بھی شامل ہوں۔ سرکاری طور پر مقرر کر دئے جائیں اور ان کو پبلک کے خزانے سے معقول تنخواہیں دی جائیں ان کے پاس فریقین کے مقدمہ کا جانا اور ان کی کچھ خدمت" کرنا قانوناً ممنوع ہو اور اسی طرح حکومت کو بھی ان کی رائے پر اثر ڈالنے کا کوئی حق نہ ہو جس طرح حاکمان عدالت پر دباؤ ڈالنے کا اسے حق نہیں ہے عدالت خود حسب موقع ان ماہرین کے پاس مقدمات کی رودادیں بھیجیں اور ان سے رائے لیں۔ اگر ان کے درمیان اختلاف رائے ہو تو وہ عدالت میں آ کر اپنے استدلال پیش کریں۔ مقدمہ

کے واقعات کی تحقیق کے لئے عدالت خود بھی گواہوں پر جرح کرے اور مفتیوں کو بھی موقع دیا جائے کہ وہ گواہوں سے تمام ایسے متعلق حالات معلوم کریں جن کا مقدمہ پر اثر پڑتا ہو اس طرح عدالتوں کا قانون سمجھنے اور مقدمات پر اس کو منطبق کرنے میں حقیقی مدد ملے گی۔ مفتیوں کا سچا اختلاف رائے بہت سے قانونی مسائل کو صاف کرے گا۔ عدالتوں کا بہت سا وقت، جو بنے ہوئے مقدمات اور مصنوعی شہادتوں کی وجہ سے اب ضائع ہوا کرتا ہے، بچ جائے گا اور مقدمہ بازی جس کی ساری گرم بازاری اس قانونی پیشے ہی کی بدولت ہے ہمارے معاشرے سے رخصت ہو جائے گی۔

رہا یہ سوال کہ اگر مقدمات کو ضابطہ کے مطابق تیار کر کے عدالتوں کے سامنے پیش کرنے والے صاحب فن لوگ موجود نہ ہوں تو اہل مقدمات کو بڑی پریشانیاں لاحق ہوں گی۔ اور وہ طرح طرح کے بے ضابطہ طریقوں سے اپنے معاملات پیش کر کے عدالتوں کو بھی پریشان کریں گے تو اس کا حل یہ ہے کہ ہم اس کے لئے مختاری کے اس پرانے طریقے کو زندہ کریں جو ہماری عدالتوں میں پہلے رائج تھا۔ ہمارے لا کالجوں کے ساتھ ایسی ضمنی کلاسیں بھی ہونی چاہئیں جن میں متوسط درجہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کو صرف قانون ضابطہ (PROCEDURAL LAW) پڑھایا جائے اور عملاً عدالتی طریق کار سے واقف کرا دیا جائے۔ ان لوگوں کا کام محض یہ ہونا چاہئے کہ ایک مقدمہ کو ضابطہ کی صورت دے کر عدالت کے سامنے پیش کرنے کے قابل بنا دیں اور مختلف مراحل پر اہل مقدمات کو عدالتی طریق کار بتاتے رہیں۔ یہ لوگ اگر فیس لے کر پریکٹس کریں تو اس سے وہ خرابیاں رونما نہیں ہو سکتیں جو پیشۂ وکالت سے رونما ہوتی ہیں۔

کورٹ فیس کا انسداد

ملک کے نظام عدل و انصاف کو اسلامی معیار پر لانے کے لئے ایک اور ضروری اصلاح یہ ہے کہ ہم اپنے ہاں سے کورٹ فیس بالکل اڑا دیں۔ یہ ایک ایسی گھناؤنی بدعت ہے جس سے ہم مسلمان مغربی تسلط سے پہلے کبھی آشنا نہیں ہوئے تھے۔ اسلامی مذاق پر یہ تصور ہی

سخت گراں ہے کہ عدالت دادرسی کی خدمت انجام دینے کے بجائے انصاف کی دوکان بن کر رہے۔ جہاں سے کوئی شخص پیسہ دئے بغیر جنس عدل حاصل نہ کر سکتا ہو اور جہاں بے زر انسان کے لئے یہی مقدر ہو کہ ظلم سہے اور داد نہ پائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ انگریزی دَور کے ساتھ اس کی یہ یادگار بھی رخصت ہو اور ہماری عدالتیں پھر سے اس اسلامی معیار پر قائم ہو جائیں جس کی رو سے انصاف رسانی ایک تجارتی کاروبار نہیں بلکہ ایک عبادت اور ایک خدمت بے مزد ہے۔ آپ سوال کر سکتے ہیں کہ اگر کورٹ فیس اڑا دی جائے تو آخر عدالتی نظام کے مصارف کہاں سے پورے ہوں گے؟ میں اس کے جواب میں دو باتیں عرض کروں گا۔ ایک یہ کہ اسلامی نظام میں اتنے لمبے چوڑے عدالتی عملے کی ضرورت باقی نہ رہے گی جسے موجودہ حالات نے ناگزیر بنا رکھا ہے۔ پیشۂ وکالت کا انسداد مقدمہ بازی کو بہت کم کردے گا اور مقدمات کا دوران بھی آج کی بہ نسبت بہت گھٹ جائے گا۔ پھر اخلاق، معاشرت اور معیشت کی اصلاح بھی مقدمہ بازی کو گھٹانے میں بہت کچھ مددگار ہوگی۔ پولیس اور جیل کے کارکنوں کی تربیت اور طریق کار کی اصلاح سے بھی جرائم کی تعداد میں بہت کمی واقع ہو جائے گی اس طرح ہمیں اپنے نظام عدالت کے لئے اتنے ججوں اور مجسٹریٹوں اور دفتری کارکنوں کی حاجت نہ رہے گی۔ جتنے اب درکار ہوتے ہیں اور اسی نسبت سے عدالتوں کے دوسرے مصارف بھی کم ہو جائیں گے۔ علاوہ بریں اسلامی نظام میں تنخواہوں کا معیار بھی وہ نہ ہوگا جو اب ہے۔

دوسرے یہ کہ ان تخفیفات کے بعد عدالتی نظام کے مصارف کا جو ہلکا بوجھ ہمارے خزانے پر باقی رہ جائے گا اس کو ہم ہر دادخواہ پر ڈالنے کے بجائے ان لوگوں پر ڈالیں گے جو عدالتوں سے بے جا استفادہ کی کوشش کریں۔ یا جن کو عدالتوں کی خدمات سے غیر معمولی فائدہ پہنچتا ہو۔ مثلاً جھوٹے مقدمات دائر کرنے والوں، جھوٹی شہادتیں دینے والوں اور عدالت کے سمنوں کی تعمیل سے گریز کرنے والوں پر جرمانے کئے جائیں۔ مجرموں پر جو جرمانے کئے جاتے ہیں وہ بھی اسی مد میں شمار ہوں اور ایک خاص مالیت سے

زیادہ کی ڈگری جن لوگوں کو ملے ان پر ایک خاص شرح سے ٹیکس لگا دیا جائے۔ اس قسم کی تدابیر کے باوجود اگر محکمۂ انصاف کے بجٹ میں کوئی خسارہ ہے تو اسے خزانۂ عامرہ سے پورا کیا جانا چاہئے۔ کیونکہ خلق کے درمیان انصاف کرنا ایک نظام حکومت کے بنیادی فرائض میں سے ہے۔

خاتمۂ کلام

یہ چند تجاویز ہیں جو میرے نزدیک اس ملک میں اسلامی قانون کے اجرا و نفاذ کو ممکن بنانے کے لئے روبعمل آنی چاہئیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اہل علم اصحاب اور وہ لوگ جو عدالت و قانون کے معاملات کا عملی تجربہ رکھتے ہیں ان پر غور فرمائیں اور انہیں مکمل کرنے کی کوشش کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری ان گزارشات سے وہ حضرات بھی ایک حد تک مطمئن ہو گئے ہوں گے جو اسلامی قانون کے نفاذ کو اب ممکن ہی نہیں سمجھتے انہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہ کام کس طرح ہو سکتا ہے اور اس کی عملی تدابیر کیا ہیں۔ لیکن جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں دنیا میں کسی چیز کی تعمیر بھی بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ اس کو جاننے والے اور اس کی خواہش اور ارادہ رکھنے والے معمار موجود ہوں، اور اس کی تعمیر کے لئے ضروری وسائل و ذرائع ان کے ہاتھ میں ہوں۔ یہ دونوں چیزیں جہاں بہم پہنچ جائیں، وہاں سب کچھ بن سکتا ہے خواہ مسجد ہو یا شوالہ۔